رجب المرجب ۱۴۴۰ھ
مارچ ۲۰۱۹ء

ماہنامہ میثاق لاہور

یکے از مطبوعات
تنظیمِ اسلامی
بانی: ڈاکٹر اسرار احمدؒ

- پلوامہ واقعہ کی آڑ میں بھارتی عزائم
- ایمان اور اس کے ثمرات و مضمرات
- اَنْ اَقِیْمُوا الدِّیْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِیْهِ

داعی رجوع الی القرآن بانی تنظیم اسلامی
محترم ڈاکٹر اسرار احمدؒ
کے شہرۂ آفاق دورۂ ترجمہ قرآن پر مشتمل

بیانُ القرآن
ترجمہ و مختصر تفسیر

خاص ایڈیشن
- دیدہ زیب ٹائٹل
- امپورٹڈ آفسٹ پیپر
- بڑے سائز میں
- عمدہ طباعت
- مضبوط جلد

سات جلدوں پر مشتمل
مکمل سیٹ کی قیمت: 4200 روپے

عوامی ایڈیشن
- کتابی سائز
- پیپر بیک بائنڈنگ
- امپورٹڈ بک پیپر
- عمدہ طباعت
- دیدہ زیب ٹائٹل

چھ جلدوں پر مشتمل
مکمل سیٹ کی قیمت: 2200 روپے

مکتبہ خُدّام القرآن لاہور
K-36، ماڈل ٹاؤن لاہور، فون 3-35869501(042)

وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيثَاقَهُ الَّذِي وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ ۙ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۡ (المائدۃ:۷)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل اور اس کے میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے مانا اور اطاعت کی!

جلد : 68

شمارہ : 3

رجب المرجب 1440ھ

مارچ 2019ء

فی شمارہ 40/-

ماہنامہ میثاق لاہور

اجرائے ثانی

ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

مدیر

حافظ عاکف سعید

نائب مدیر

حافظ خالد محمود خضر

سالانہ زرِتعاون

- اندرون ملک 400 روپے
- بھارت وبنگلہ دیش 900 روپے
- ایشیا، یورپ، افریقہ وغیرہ 1200 روپے
- امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا وغیرہ 1500 روپے

ترسیل زر: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

مکتبہ خدام القرآن لاہور

مقام اشاعت: 36۔ کے ماڈل ٹاؤن، لاہور 54700 ' فون: 3-35869501

فیکس: 35834000، ای میل: maktaba@tanzeem.org

ای میل برائے ادارتی امور: publications@tanzeem.org

ویب سائٹ ایڈریس: www.tanzeem.org

مرکزی دفتر تنظیم اسلامی: "دارالاسلام" ملتان روڈ چوہنگ لاہور

(پوسٹل کوڈ 53800) فون: 79-35473375 (042)

پبلشر: ناظم مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

طابع: رشید احمد چوہدری مطبع: مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

مشمولات

عرضِ احوال ——— 5

پلوامہ واقعہ کی آڑ میں بھارتی عزائم — ادارہ

بیانُ القُرآن ——— 9

سورۃ الزمر (آیات ۱ تا ۲۰) — ڈاکٹر اسرار احمدؒ

دعوت و عزیمت ——— 28

اَنْ اَقِیْمُوا الدِّیْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِیْہِ — انجینئر محمد رشید عمر

مطالعہ قرآن حکیم ——— 39

ایمان اور اس کے ثمرات و مضمرات — شجاع الدین شیخ

انوارِ ھدایت ——— 49

غیبت اور بہتان — پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

تربیتِ نسواں ——— 55

اعلیٰ کامیابی: جنت کی ڈگری — بیگم ڈاکٹر عبدالخالق

فقہ و اصولِ فقہ ——— 65

اصلی اور فرعی مسائل میں

مخالفین کے ساتھ برتاؤ کے فقہی ضابطے (۶) — ڈاکٹر احمد بن سعد الغامدیؒ

یادِ رفتگاں ——— 83

مولانا محمد منظور نعمانیؒ اور ابا جی (۴) — پروفیسر حافظ قاسم رضوان

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پلوامہ واقعہ کی آڑ میں بھارتی عزائم

۱۴فروری ۲۰۱۹ء کو مقبوضہ کشمیر کے علاقہ پلوامہ میں بھارتی ریزرو پولیس فورس کے ۴۶اہلکار ایک بم دھماکے میں مارے گئے اور متعدد زخمی ہوئے۔ بھارتی میڈیا اور حکومت نے حسبِ سابق فوراً سے پہلے اس کا الزام پاکستان پر لگایا اور پروپیگنڈا شروع کر دیا کہ یہ حملہ جیشِ محمد نے کرایا ہے۔ واقعہ کے فوراً بعد کشمیر اور پورے انڈیا میں مسلمانوں کے خلاف انتہا پسند ہندوؤں کی پرتشدد کارروائیوں اور جلاؤ گھیراؤ کا آغاز ہو گیا۔ کئی علاقوں میں بھارتی فوج اور پولیس کی موجودگی میں مسلمانوں کی املاک جلائی گئیں اور نہتّے مسلمانوں پر تشدد کیا گیا مگر پولیس اور فوج محض تماشائی بنی رہی۔ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں زیرِ تعلیم کشمیری طلبہ کو ہراساں کیا گیا' ان پر تشدد کیا گیا۔ راجستھان اور دیگر کئی علاقوں میں پاکستانی شہریوں کو فی الفور ملک چھوڑنے کا سرکاری سطح پر کہا گیا۔ جیلوں میں پاکستانی قیدیوں کو شہید کیا گیا۔ پاکستان کے ساتھ تجارت روک دی گئی اور بھارتی حکومت اور فوج کی جانب سے پاکستان کے خلاف کارروائی کرنے کا اعلان کیا گیا۔ اس طرح پلوامہ واقعہ کے بعد بھارت نے خطے میں ایک جنگی ماحول پیدا کر دیا ہے۔

پلوامہ واقعہ کی حقیقت کیا تھی' اس حوالے سے اب تک بہت کچھ کہا اور لکھا جا چکا ہے۔ یہاں تک کہ سب سے زیادہ ثبوت بھی اس بات کے بھارت کے اندر سے ہی آ رہے ہیں کہ مودی سرکار نے یہ ڈراما خود رچایا ہے اور حالات اور واقعات بھی یہی بتا رہے ہیں کہ مودی سرکار اس وقت جس پوزیشن میں ہے اس کو اپنی ساکھ بچانے کے لیے اس کے علاوہ کوئی راستہ بچا بھی نہیں تھا کہ وہ اس طرح کا کوئی ڈرامہ کر کے اور اس کی آڑ میں ایسے حالات پیدا کر کے اس پوزیشن سے نکلنے کی کوشش کرے۔ پلوامہ واقعہ سے کچھ دن قبل ہی مودی کا دورۂ کشمیر تھا۔ اگر خود بھارت کے اندر سے آنے والی یہ خبریں سچی ہیں کہ مودی سرکار نے یہ حملہ خود کروایا تو ظاہر ہے اس کی پلاننگ مودی کے دورۂ کشمیر کے دوران ہی کی گئی ہو گی۔ ہمارے خیال میں مودی سرکار نے پلوامہ واقعہ کا ڈرامارچا کر ایک تیر سے کئی شکار کرنے کی کوشش کی ہے۔

بھارت میں ایک روایت بن چکی ہے کہ جب بھی عام انتخابات قریب آتے ہیں تو برسرِاقتدار پارٹی پاکستان کے خلاف ہوا کھڑا کر کے ہندو اکثریت کے جذبات بھڑکانے اور پھر انہیں الیکشن میں کیش کرنے کی کوشش ضرور کرتی ہے۔ اس سے قبل بھارت کی تمام سیاسی پارٹیاں یہ کھیل کھیل چکی ہیں۔ خاص طور پر جب بات کی جائے بی جے پی کی تو اس کی بنیاد ہی مسلم کش فلسفے پر رکھی گئی ہے اور اس کا اقتدار میں آنا بھی مسلم کشی کی وجہ سے ہوا ہے۔ حیدرآباد اور گجرات میں تیس ہزار مسلمانوں کو قتل کرنے اور لاکھوں مسلمانوں کو بے گھر اور بے روزگار کرنے کے بعد بی جے پی حکومت میں آئی ہے۔ اس کے دورِ حکومت میں بھارت ہندو انتہا پسندی اور دہشت گردی کا گڑھ بنا رہا ہے۔ دلتوں اور دیگر نچلی ذات کے ہندوؤں سمیت تمام اقلیتوں کے لیے بھارت بی جے پی کے دورِ حکومت میں جہنم بنا رہا ہے' جس کی وجہ سے دنیا میں بھارت کا سیکولر چہرہ بے نقاب ہو چکا ہے اور بھارت کا عام شہری بھی یہ سمجھنے لگا ہے کہ مودی اور بی جے پی کے انتہا پسندانہ فلسفے اور طرزِ سیاست نے بھارت کو بجائے فائدہ پہنچانے کے اُلٹا نقصان پہنچایا ہے' بلکہ انڈیا کا چہرہ دنیا میں بی جے پی کی طرزِ سیاست سے داغدار ہو چکا ہے۔ پلوامہ حملے سے چند روز قبل ہی بھارت کے سابق چیف جسٹس نے واشگاف الفاظ میں اعتراف کرتے ہوئے کہا کہ بی جے پی نے انڈیا کو دنیا میں مذاق بنا کر رکھ دیا ہے۔ اس نے یہاں تک کہہ دیا کہ دنیا ہم پر ہنستی ہے کہ بھارت میں گدھے بھرے پڑے ہیں۔ یہی حال بی جے پی کا معاشی میدان میں بھی ہوا ہے کہ جو سہانے سپنے اس حوالے سے بھارتی عوام کو دکھائے گئے تھے حقائق اس کے برعکس سامنے آئے ہیں۔ ان حالات میں مودی سرکار اور بی جے پی کی ساکھ اتنی خراب ہو چکی ہے کہ اس کا آئندہ الیکشن میں جیتنا محال ہو چکا ہے اور اس کے پاس کوئی چارۂ کار اس کے سوا نہیں رہا تھا کہ وہ ایک بار پھر اُسی روایت کو دہرائے جو ہمیشہ بھارت میں الیکشن سے قبل دہرائی جاتی رہی ہے کہ بھارت میں خود کوئی دہشت گردانہ کارروائی کر کے اس کا الزام پاکستان پر لگا دو اور اس کی آڑ میں نفرت کی فضا پیدا کر کے ہندو اکثریت کی ہمدردیاں جیت لو اور اس طرح حکومت میں آ جاؤ۔ لیکن لگتا ہے کہ اس بار بھارت میں الیکشن جیتنے کا یہ سب سے بڑا حربہ بھی ناکام ہو چکا ہے اور فضا مودی سرکار کے حق میں جانے کی بجائے اس کے خلاف بن چکی ہے۔ بھارت کے اندر سے بھی کچھ آوازیں اُٹھ رہی ہیں کہ مودی سرکار نے الیکشن جیتنے کے لیے یہ سب ڈرامارچایا ہے۔ ان آواز اُٹھانے والوں میں سیاسی' سماجی' عسکری سمیت تمام شعبوں کی

بڑی شخصیات بھی شامل ہیں۔سابق بھارتی فوجی کمانڈر لیفٹیننٹ جنرل (ر) دیپندر اسنگھ ہوڈا نے ''نیویارک ٹائمز'' سے بات کرتے ہوئے واضح الفاظ میں اعتراف کیا کہ پلوامہ حملے میں بھارت کا ہی بارود استعمال کیا گیا۔اس نے واضح طور پر کہا کہ پلوامہ واقعہ میں ساڑھے سات سو پاؤنڈ بارود استعمال ہوا اور یہ ممکن نہیں کہ اتنی بڑی مقدار میں بارود سرحد پار سے دراندازی کے ذریعے لایا جا سکے۔اسی طرح معروف بھارتی سماجی و مذہبی رہنما سوامی اگنی ویش نے کہا کہ بی جے پی حکومت حالات خراب کرنے پر تلی ہوئی ہے تاکہ آئندہ پارلیمانی انتخابات میں ووٹ بٹور سکے۔اس نے واضح طور پر کہا کہ مودی سرکار بھارتی فوجی جوانوں کو اپنے سیاسی مقاصد کے لیے مروا رہی ہے۔

پلوامہ واقعہ کے بعد وزیراعظم پاکستان عمران خان نے بھارتی الزامات کا جواب جس قدر نپے تُلے اور مدلّل انداز میں دیا اس نے بھارتی غبارے سے ہوا مزید نکال دی اور بھارت کے عوام پر یہ حقیقت مزید کھل کر سامنے آ گئی کہ مودی سرکار اپنے سیاسی مقاصد کے لیے بھارت کے امن کو داؤ پر لگا رہی ہے۔یہی وجہ ہے وزیراعظم پاکستان عمران خان کی پریس کانفرنس کا انڈیا کے کئی حلقوں میں خیر مقدم کیا گیا ہے۔خاص طور پر سکھ برادری نے نہ صرف کھل کر پاکستان کے موقف کی حمایت کر دی ہے بلکہ عملی طور پر بھی بھارت کے مظلوم مسلمانوں کے لیے ڈھال بن کر ثابت کیا ہے کہ ہندوستان کی سکھ برادری مسلمانوں کے ساتھ کھڑی ہے۔اس حوالے سے خالصتان انٹرنیشنل افیئرز سنٹر امریکہ کے سربراہ ڈاکٹر امرجیت سنگھ نے کہا کہ عمران خان نے ایک منجھے ہوئے سیاستدان کی طرح تقریر کر کے بھارت کو واضح پیغام دے دیا' اُمید ہے کہ ان کی اس مختصر تقریر کو مودی حکومت ایک وارننگ سمجھے گی۔اگر بھارت نے انتہا پسندانہ رویہ اختیار کیا اور پاکستان پر کوئی جنگ مسلّط کی تو پھر دنیا بھر کے سکھ پاکستان کے ساتھ ہوں گے اور پاکستان میں موجود سکھ پاکستانی فوج کے شانہ بشانہ لڑیں گے۔یہی نہیں بلکہ کئی سکھوں نے تحریک آزادیٔ کشمیر کی حمایت کا اعلان بھی کر دیا ہے۔

پلوامہ ڈراما سے دوسرا بڑا مقصد جو مودی سرکار حاصل کرنا چاہتی تھی وہ تھا تحریک آزادیٔ کشمیر کو سبوتاژ کرنا۔گزشتہ دو سال میں بھارتی جبر و ستم کے باوجود کشمیریوں نے اپنے لہو سے جس طرح تحریک آزادی کو نکھارا ہے اس سے ساری دنیا کے سامنے کشمیر پر بھارتی دعویٰ کی قلعی کھل چکی ہے۔پلوامہ واقعہ سے چند روز قبل ہی برطانیہ کے ہاوس آف کامنز میں کشمیر کانفرنس کا

انعقاد ہوا جس میں برطانیہ کی دونوں بڑی سیاسی پارٹیوں کے اراکین نے شرکت کی۔اس کانفرنس میں بھارتی مظالم کی تصویری نمائش بھی کی گئی تھی۔ہاؤس آف کامنز میں کشمیر کانفرنس کا انعقاد اور اس میں برطانیہ کی دونوں بڑی سیاسی پارٹیوں کے اراکین کی شرکت اس بات کا واضح ثبوت تھی کہ عالمی رائے عامہ کشمیریوں کی آزادی کے حق میں ہموار ہو چکی ہے اور دنیا بھی یہی چاہتی ہے کہ کشمیر آزاد ہو۔لیکن بھارت کو یہ قطعاً منظور نہیں ہے' اس لیے اس نے تحریک آزادیٔ کشمیر کو سبوتاژ کرنے کے لیے پلوامہ واقعہ کا ڈراما رچا کر دنیا کے سامنے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ مسئلہ کشمیر دراصل پاکستان کا پیدا کیا ہوا مسئلہ ہے' ورنہ کشمیر کا کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔

اس کے علاوہ سعودی عرب کے ولی عہد محمد بن سلمان بھی پاکستان کے دورہ پر آنے والے تھے اور یہ پاک سعودیہ تعلقات کی تاریخ کا ایک اہم ترین دورہ تھا' جس سے پاکستان کو کئی سیاسی اور معاشی فائدے حاصل ہونے والے تھے۔جبکہ بھارت کبھی بھی اس بات کے حق میں نہیں رہا کہ پاکستان کے کسی بھی ملک سے مثالی سفارتی تعلقات قائم ہوں' بلکہ بھارتی وزارت خارجہ کا سب سے بڑا ہدف ہی پاکستان کو سفارتی سطح پر شکست دینا رہا ہے۔لہٰذا پلوامہ واقعہ کا ڈراما رچانے کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ پاکستان کو ایک دہشت گرد ملک ثابت کیا جائے اور سعودی عرب سمیت دنیا کو اس کے ذریعے یہ پیغام دیا جائے کہ پاکستان میں سرمایہ کاری نہ کی جائے۔لیکن بھارت کا یہ حربہ بھی ناکام ہوا۔سعودی ولی عہد نے نہ صرف اس کے باوجود پاکستان کا دورہ کیا بلکہ بھارت میں جا کر بھی مشترکہ اعلامیہ میں پلوامہ واقعہ کا ذکر تک نہیں کیا۔گویا پلوامہ واقعہ کی حقیقت عالمی سطح پر بھی دنیا کے سامنے آ چکی ہے۔

یہ بھی حقیقت ہے کہ ہندوستان میں دلت اور دیگر نچلی ذات کے ہندو نہ صرف مسلمانوں کے لیے نرم گوشہ رکھتے ہیں بلکہ ذات پات کے ہندوانہ سسٹم سے نکلنے کے لیے آئے روز کئی ایسے خاندان اسلام بھی قبول کر رہے ہیں۔جبکہ پلوامہ حملے میں دلت فوجیوں کو مروا کر مودی سرکار نے دلتوں کو بھی یہ پیغام دیا ہے کہ مسلمان دہشت گرد اور تمہارے دشمن ہیں۔

پلوامہ واقعہ کے ضمن میں یہ حقیقت بھی مدنظر رہنی چاہیے کہ خطہ میں اس وقت ایک گریٹ گیم بھی چل رہی ہے۔چائنا مستقبل کی معاشی طاقت کے طور پر اُبھر رہا ہے اور سی پیک اور OROB جیسے منصوبوں کے ذریعے اس کے معاشی تعلقات وسط ایشیائی ریاستوں' مڈل ایسٹ' افریقہ اور مشرقی یورپ تک پھیل رہے ہیں۔ (باقی صفحہ 98 پر)

دورۂ ترجمۂ قرآن

ڈاکٹر اسرار احمد

سُورۃُ الزُّمَر

تمہیدی کلمات

سورۂ صٓ کے اختتام پر زیر مطالعہ گروپ کی پہلی پانچ سورتیں مکمل ہو چکی ہیں۔ اس گروپ کے اندر ان پانچ سورتوں (سورۂ سبا تا سورۂ صٓ) پر مشتمل ایک ضمنی گروپ بنتا ہے جس کے بالکل وسط میں سورۂ یٰسٓ ہے۔ یعنی سورۂ سبا اور سورۂ فاطر (یہ دونوں سورتیں اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ سے شروع ہوتی ہیں) ایک طرف ہیں جبکہ سورۃ الصّٰفّٰت اور سورۂ صٓ (ان دونوں سورتوں کے آغاز میں حرف ''ص'' مشترک ہے) دوسری طرف جبکہ عین وسط میں سورۂ یٰسٓ ہے۔

اس گروپ کی بقیہ آٹھ سورتیں (سورۃ الزمر تا سورۃ الاحقاف) ایک لحاظ سے گزشتہ گروپ کی سورۃ الفرقان سے لے کر سورۃ السجدۃ تک کی آٹھ سورتوں سے مشابہت رکھتی ہیں۔ مذکورہ آٹھ سورتوں میں بھی ایک سورۃ (الفرقان) حروفِ مقطعات کے بغیر ہے جبکہ باقی سات سورتوں کا آغاز حروفِ مقطعات سے ہوتا ہے۔ یعنی سورۃ الشعراء اور سورۃ القصص کا آغاز طٰسٓمٓ سے، سورۃ النمل کا طٰسٓ سے اور باقی چار سورتوں (العنکبوت، الروم، لقمان اور السجدۃ) کا آغاز الٓمٓ سے ہوتا ہے۔ اسی طرح زیر مطالعہ گروپ کی آٹھ سورتوں میں بھی ایک سورۃ (الزمر) ایسی ہے جس کے آغاز میں حروفِ مقطعات نہیں ہیں، جبکہ باقی ساتوں سورتیں حروفِ مقطعات (حٰمٓ) سے شروع ہو رہی ہیں۔ حٰمٓ سے آغاز ہونے کی وجہ سے ان سورتوں کو ''حوامیم'' بھی کہا جاتا ہے۔ ان میں سورۃ الشوریٰ البتہ ایک ایسی سورت ہے جس کی دوسری آیت بھی حروفِ مقطعات (عٓسٓقٓ) پر مشتمل ہے۔ مضمون کے اعتبار سے یہ آٹھوں سورتیں ایک خاص ترتیب (sequence) میں ہیں۔ واضح رہے کہ اس سلسلۂ حوامیم میں معنوی طور پر سورۃ الزمر بھی شامل ہے۔ ان میں سے پہلی چار سورتوں کا مرکزی مضمون ''توحید عملی'' ہے۔

''توحید عملی'' چونکہ بہت اہم مضمون ہے، اس لیے ضروری ہے کہ اسے اچھی طرح سے سمجھ لیا جائے۔ عقیدے کے طور پر توحید کو تو ہم سب جانتے ہیں، یعنی اللہ کو ایک ماننا اور یہ ماننا کہ وہ اکیلا اور تنہا ہے (لَا ضِدَّ لَہٗ وَلَا نِدَّ لَہٗ وَلَا مِثْلَ لَہٗ وَلَا مِثَالَ لَہٗ وَلَا مَثِیْلَ لَہٗ)۔ اُس کا کوئی کُفُو نہیں، اُس جیسا کوئی نہیں، نہ تو ذات میں اور نہ ہی صفات کے اعتبار سے۔ اسی عقیدہ کی وضاحت ہمیں بہت جامع اور خوبصورت انداز میں سورۃ الاخلاص میں ملتی ہے:

﴿قُلْ ھُوَ اللّٰہُ اَحَدٌ ۝۱ اَللّٰہُ الصَّمَدُ ۝۲ لَمْ یَلِدْ ۙ وَلَمْ یُوْلَدْ ۝۳ وَلَمْ یَکُنْ لَّہٗ کُفُوًا اَحَدٌ ۝۴﴾

عقیدۂ توحید کا عملی پہلو ''توحید فی العمل'' ہے، جس کے لیے امام ابن تیمیہؒ نے ''توحید فی الطلب'' کی خوبصورت اصطلاح استعمال کی ہے۔ ''طلب'' کا تعلق انسان کی عملی زندگی سے ہے۔ کسی انسان کی ''طلب'' کے انتخاب اور معیار سے عملی زندگی میں اس کی ترجیحات کا پتا چلتا ہے۔ اس لحاظ سے ہر انسان گویا ''طالب'' ہے اور ہر انسان اپنا کوئی نہ کوئی مطلوب بھی رکھتا ہے۔ سورۃ الحج کی آیت ۷۳ میں بتوں اور ان کے پجاریوں کے حوالے سے طالب اور مطلوب کے اس رشتے کی اہمیت اور نوعیت کو ﴿ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوْبُ ۝۷۳﴾ کے الفاظ میں بیان فرمایا گیا ہے۔ بہر حال ایک ذی شعور مخلوق ہونے کی حیثیت سے لازمی ہے کہ ہر انسان کا کوئی مطلوب، کوئی آئیڈیل یا کوئی آدرش ہو، جسے وہ اپنا مقصدِ حیات سمجھے۔ مگر عملی طور پر ایسا نہیں ہے۔ عملی طور پر انسانوں کی عظیم اکثریت کا کوئی اعلیٰ مقصدِ حیات ہے ہی نہیں اور وہ محض اپنی جبلت (instinct) کے محرکات کے تحت حیوانی سطح پر زندگی گزار رہے ہیں۔ جس طرح حیوانات اپنی جبلی خواہشات پوری کرتے ہیں اسی طرح وہ بھی کھاتے پیتے ہیں، بچے پیدا کرتے ہیں اور ان کی پرورش کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ اور کوئی مقصد ان کی زندگی میں نہیں ہے۔ قرآن کی رائے میں ایسے لوگ انسان نہیں، حیوان ہیں، بلکہ حیوانوں سے بھی بدتر ہیں: ﴿اُولٰٓئِکَ کَالْاَنْعَامِ بَلْ ھُمْ اَضَلُّ ۭ﴾ (الاعراف: ۱۷۹)

اس زاویہ سے دیکھا جائے تو انسان کہلانے کا مستحق صرف وہی شخص ہو سکتا ہے جو محض اپنی جبلی خواہشات کا غلام بن کر نہ رہ گیا ہو بلکہ اس نے اس سطح سے برتر ہو کر اپنی زندگی کا کوئی اعلیٰ مقصد متعین کر رکھا ہو۔ اس حوالے سے جو اصل مقام و مرتبہ ایک انسان کے شایانِ شان ہے وہ یہ ہے کہ اس کا مقصدِ حیات اس کا خالق اور اس کا مالک ہو۔ یعنی صرف اللہ ہی اس کا مقصود ہو، وہی اس کا محبوب ہو اور وہی اس کا مطلوب ہو: لَا مَطْلُوْبَ اِلَّا اللّٰہُ، لَا مَقْصُوْدَ اِلَّا اللّٰہُ، لَا

مَحْبُوْبَ اِلَّا اللّٰہُ ۔ زندگی میں ہر ہر قدم اور ہر ہر موڑ پر اس کی نگاہیں اس شان سے اللہ کی رضا مندی کی متلاشی ہوں کہ اس کی زندگی اس فرمانِ الٰہی کی عملی تصویر بن جائے: ﴿قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۱۶۲﴾﴾ (الانعام) ’’آپؐ کہیے میری نماز‘ میری قربانی‘ میری زندگی اور میری موت اللہ ہی کے لیے ہے جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے۔‘‘

یہ ہے توحید عملی یا توحید فی الطلب کا اصل مفہوم و مدّعا۔ لیکن جو شخص صرف ’’عقیدۂ توحید‘‘ کا دعوے دار ہے اور عملی طور پر وہ توحید پر کاربند نہیں‘ وہ شرک فی العمل کا مرتکب ہے۔ سورۃ الفرقان میں ہم یہ آیت پڑھ چکے ہیں: ﴿اَرَءَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰـھَہٗ ھَوٰىہُ ؕ اَفَاَنْتَ تَکُوْنُ عَلَیْہِ وَکِیْلًا ﴿۴۳﴾﴾ ’’کیا آپ نے دیکھا اس شخص کو جس نے اپنی خواہش نفس کو اپنا معبود بنالیا ہے؟ تو (اے نبی ﷺ) کیا آپ ایسے شخص کی ذمہ داری لے سکتے ہیں!‘‘ ایسا شخص کہتا تو خود کو مواحد ہے اور وہ نظریۂ توحید پر ایمان کا دعویٰ بھی کرتا ہے‘ مگر عملی زندگی میں وہ اپنی نفسانی خواہشات کی تکمیل کے لیے اللہ کے احکام کو پامال کرنے سے دریغ نہیں کرتا اور حلال وحرام کے ضمن میں حدود اللہ کی سرے سے کوئی پروا نہیں کرتا۔ ایسے ہی شخص کو حضور ﷺ نے ’’درہم و دینار کا بندہ‘‘ قرار دیا ہے۔ آپ ﷺ کا فرمان ہے: ((تَعِسَ عَبْدُ الدِّیْنَارِ وَعَبْدُ الدِّرْھَمِ ......))(۱) یہ ایک ایسا کردار ہے جس کا نام تو عبداللہ یا عبدالرحمٰن ہے‘ زبان سے وہ لا اِلٰہ اِلَّا اللّٰہ کا اقرار بھی کرتا ہے‘ اس کلمہ توحید کے ورد کا اہتمام بھی کرتا ہے اور مسجد میں جا جا کر با جماعت نمازیں بھی پڑھتا ہے‘ مگر اُس کی عملی زندگی میں توحید کہیں نظر نہیں آتی۔ عملی زندگی میں اس نے اپنا مقصدِ حیات حصولِ دولت کو بنا رکھا ہے‘ اس کی فکر کا محور اور اس کی ساری دوڑ دھوپ کا ہدف ہی یہ ہے کہ اسے دولت ملنی چاہیے‘ جہاں سے بھی ملے‘ جیسے بھی ملے۔ جائز طریقے سے ملے یا ناجائز طور سے۔ گویا اس نے اپنے عمل سے ثابت کر دیا ہے کہ اصل میں وہ ’’عبداللہ‘‘ یا ’’عبدالرحمٰن‘‘ نہیں ’’عبدالدینار‘‘ ہے اور عملی طور پر اس کا معبود اللہ نہیں بلکہ روپیہ‘ دینار یا ڈالر ہے۔

اس میدان میں ہم مسلمان ایک لحاظ سے ہندوؤں سے بھی آگے نکل گئے ہیں۔ ہندو دولت حاصل کرنے کے لیے دولت کی دیوی لکشمی بائی کی پوجا کرتے ہیں‘ وہ سمجھتے ہیں کہ اس کی کِرپا ہو جائے گی تو دولت کے دروازے کھل جائیں گے۔ ہم دیوی بنانے اور اس کو پوجنے کو تو شرک تصور کرتے ہیں‘ مگر براہِ راست دولت کی پوجا کو روا سمجھتے ہیں۔ چنانچہ ہندو

(۱) صحیح البخاری‘ کتاب الجهاد والسیر‘ باب الحراسة فی الغزو فی سبیل اللّٰہ۔

دولت کی دیوی کے پجاری بنے تھے‘ لیکن ہم براہِ راست دولت کے پجاری بن گئے۔

توحید عملی کا پہلا نکتہ توحید فی العبادت ہے۔ یعنی بندگی اور اطاعت کُل کی کُل اللہ کے لیے ہو۔ باقی سب اطاعتیں اس اطاعت کے تابع ہوں۔ ماں‘ باپ اور استاد کی اطاعت ضرور ہو‘ مگر شریعت کے دائرے کے اندر رہتے ہوئے۔ حاکم کا حکم بھی مانا جائے مگر صرف وہ جو اللہ کے کسی حکم کے خلاف نہ ہو۔ اس حوالے سے بنیادی اصول اور قانون یہ ہوگا: ((لَا طَاعَةَ لِمَخْلُوْقٍ فِیْ مَعْصِیَةِ الْخَالِقِ))(۱) یعنی مخلوق میں سے ایسی اطاعت کسی کی نہیں ہو سکتی جس سے خالق کی معصیت لازم آتی ہو۔ اگر ایسا ہوا تو یہ شرک ہوگا‘ کیونکہ اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں جس کسی کو بھی ’’مطاع‘‘ مانا گیا‘ وہ چاہے کسی کا اپنا نفس ہو‘ حاکم وقت ہو‘ کوئی ادارہ ہو یا جو کوئی بھی ہو وہ ’’طاغوت‘‘ ہے۔ سورۃ الزمر میں یہ مضمون بہت تکرار سے آئے گا کہ ایک بندہ اللہ تعالیٰ کی بندگی کرے تو اُس کے لیے اپنی اطاعت کو خالص کرتے ہوئے کرے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

آیات ۱ تا ۸

تَنْزِیْلُ الْکِتٰبِ مِنَ اللّٰہِ الْعَزِیْزِ الْحَکِیْمِ ﴿۱﴾ اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَیْکَ الْکِتٰبَ بِالْحَقِّ فَاعْبُدِ اللّٰہَ مُخْلِصًا لَّہُ الدِّیْنَ ﴿۲﴾ اَلَا لِلّٰہِ الدِّیْنُ الْخَالِصُ ؕ وَالَّذِیْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِہٖٓ اَوْلِیَآءَ ۘ مَا نَعْبُدُھُمْ اِلَّا لِیُقَرِّبُوْنَآ اِلَی اللّٰہِ زُلْفٰی ؕ اِنَّ اللّٰہَ یَحْکُمُ بَیْنَھُمْ فِیْ مَا ھُمْ فِیْہِ یَخْتَلِفُوْنَ ؕ۬ اِنَّ اللّٰہَ لَا یَھْدِیْ مَنْ ھُوَ کٰذِبٌ کَفَّارٌ ﴿۳﴾ لَوْ اَرَادَ اللّٰہُ اَنْ یَّتَّخِذَ وَلَدًا لَّاصْطَفٰی مِمَّا یَخْلُقُ مَا یَشَآءُ ۙ سُبْحٰنَہٗ ؕ ھُوَ اللّٰہُ الْوَاحِدُ الْقَھَّارُ ﴿۴﴾ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ۚ یُکَوِّرُ الَّیْلَ عَلَی النَّھَارِ وَیُکَوِّرُ النَّھَارَ عَلَی الَّیْلِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ؕ کُلٌّ یَّجْرِیْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّی ؕ اَلَا ھُوَ الْعَزِیْزُ الْغَفَّارُ ﴿۵﴾ خَلَقَکُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَۃٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْھَا زَوْجَھَا وَاَنْزَلَ لَکُمْ مِّنَ الْاَنْعَامِ ثَمٰنِیَۃَ اَزْوَاجٍ ؕ یَخْلُقُکُمْ فِیْ بُطُوْنِ اُمَّھٰتِکُمْ خَلْقًا مِّنْۢ بَعْدِ خَلْقٍ فِیْ ظُلُمٰتٍ ثَلٰثٍ ؕ ذٰلِکُمُ اللّٰہُ رَبُّکُمْ لَہُ الْمُلْکُ ؕ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ ۚ فَاَنّٰی تُصْرَفُوْنَ ﴿۶﴾ اِنْ تَکْفُرُوْا فَاِنَّ اللّٰہَ

(۱) المعجم الاوسط للطبرانی: ۱۸۱/۴

غَنِيٌّ عَنْكُمْ ۭ وَلَا يَرْضٰى لِعِبَادِهِ الْكُفْرَ ۚ وَاِنْ تَشْكُرُوْا يَرْضَهُ لَكُمْ ۭ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ۭ ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ مَّرْجِعُكُمْ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۭ اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝ وَاِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ ضُرٌّ دَعَا رَبَّهٗ مُنِيْبًا اِلَيْهِ ثُمَّ اِذَا خَوَّلَهٗ نِعْمَةً مِّنْهُ نَسِيَ مَا كَانَ يَدْعُوْٓا اِلَيْهِ مِنْ قَبْلُ وَجَعَلَ لِلّٰهِ اَنْدَادًا لِّيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ ۭ قُلْ تَمَتَّعْ بِكُفْرِكَ قَلِيْلًا ۣ اِنَّكَ مِنْ اَصْحٰبِ النَّارِ ۝

آیت ۱ ﴿تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ۝۱﴾ ’’اس کتاب کا نازل کیا جانا ہے اُس اللہ کی طرف سے جو زبردست‘ کمال حکمت والا ہے۔‘‘

سورۃ الزمر اور سورۃ المؤمن کا آپس میں جوڑے کا تعلق ہے۔ چنانچہ ان دونوں سورتوں کا آغاز بھی ایک جیسے الفاظ سے ہو رہا ہے‘ صرف ’’الحکیم‘‘ اور ’’العلیم‘‘ کا فرق ہے۔ جیسے کہ پہلے بھی ذکر ہو چکا ہے کہ زیر مطالعہ ضمنی گروپ کی ان آٹھ سورتوں میں سے پہلی سورت یعنی سورۃ الزمر کے آغاز میں حروفِ مقطعات نہیں ہیں جبکہ باقی ساتوں سورتیں (سورۃ المؤمن تا سورۃ الاحقاف) حٰمٓ کے حروف سے شروع ہوتی ہیں۔

آیت ۲ ﴿اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ﴾ ’’(اے نبی ﷺ!) ہم نے آپ پر یہ کتاب اُتاری ہے حق کے ساتھ‘‘

﴿فَاعْبُدِ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ ۝۲﴾ ’’پس بندگی کرو اللہ کی اپنی اطاعت کو اُس کے لیے خالص کرتے ہوئے۔‘‘

اس حکم کے برعکس آج عملی طور پر ہماری زندگیوں کا نقشہ یہ ہے کہ اللہ کی بندگی بھی ہو رہی ہے اور ساتھ ہی ساتھ طاغوت کو بھی پوجا جا رہا ہے۔ ایک طرف نمازیں پڑھی جا رہی ہیں‘ حج اور عمرے ادا کیے جا رہے ہیں جبکہ دوسری طرف حرام خوری بھی جاری ہے اور سودی کاروبار بھی چل رہا ہے۔ اللہ کو ایسی آلودہ (polluted) بندگی کی ضرورت نہیں۔ وہ تو اپنے بندوں سے خالص بندگی کا تقاضا کرتا ہے۔

آیت ۳ ﴿اَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ ۭ﴾ ’’آگاہ ہو جاؤ کہ اطاعتِ خالص اللہ ہی کا حق ہے۔‘‘

اللہ کے ہاں صرف دین خالص ہی مقبول ہے۔ اللہ کو یہ ہرگز منظور نہیں کہ اُس کا کوئی بندہ اُس کی بندگی بھی کرے اور اپنی بندگی کا کچھ حصہ کسی دوسرے کے لیے بھی مختص کر لے۔ اللہ

تعالیٰ بہت غیور ہے‘ وہ شراکت کی بندگی کو واپس اس بندے کے مُنہ پر دے مارتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ میرا بننا ہے تو خالصتاً میرے بنو: ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَاۗفَّةً ۠﴾ (البقرہ:۲۰۸) ’’اے اہلِ ایمان! اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ‘‘۔ اللہ تعالیٰ کے کچھ احکام ماننے اور کچھ نہ ماننے کے حوالے سے سورۃ البقرۃ کی اس آیت میں بہت سخت وعید آئی ہے:

﴿اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ۚ فَمَا جَزَاۗءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ ۭ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ۝۸۵﴾

’’تو کیا تم (ہماری) کتاب کے ایک حصے کو مانتے ہو اور ایک حصے کا انکار کر دیتے ہو؟ تو نہیں ہے کوئی سزا اس کی جو تم میں سے یہ حرکت کرے سوائے دنیا کی زندگی میں ذلت و رسوائی کے‘ اور قیامت کے روز وہ لوٹا دیے جائیں گے شدید ترین عذاب کی طرف۔ اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے بے خبر نہیں ہے۔‘‘

سیاق و سباق کے لحاظ سے اگرچہ اس آیت کے مخاطب بنی اسرائیل ہیں لیکن آج ہمارے لیے بھی اللہ کا حکم اور قانون یہی ہے۔ بلکہ یہ آیت ہمارے لیے آئینے کی حیثیت رکھتی ہے جس میں آج ہم اپنی تصویر واضح طور پر دیکھ سکتے ہیں۔ دنیا کی جس رسوائی کا ذکر اس آیت میں ہوا ہے وہ آج ہمارے ماتھے پر جلی حروف میں لکھی ہوئی صاف نظر آ رہی ہے۔ اس وقت مسلمان تعداد میں ڈیڑھ سو کروڑ سے بھی زائد ہیں مگر عزت نام کی کوئی چیز اس وقت ان کے پاس نہیں ہے۔ بین الاقوامی معاملات میں کسی کو ان سے ان کی رائے پوچھنا بھی گوارا نہیں۔

﴿وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَاۗءَ ۘ﴾ ’’اور جن لوگوں نے اللہ کے سوا کچھ اور کو اولیاء بنایا ہوا ہے‘‘

﴿مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى ۭ﴾ ’’(وہ کہتے ہیں کہ) ہم تو ان کو صرف اس لیے پوجتے ہیں کہ یہ ہمیں اللہ سے قریب کر دیں۔‘‘

یعنی اصل میں تو ہم اللہ ہی کو پوجتے ہیں‘ جبکہ دوسرے معبودوں کو تو ہم اللہ تک پہنچنے اور اس کا قرب حاصل کرنے کا صرف وسیلہ سمجھتے ہیں۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ فِيْ مَا هُمْ فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ۭ﴾ ’’یقیناً اللہ فیصلہ کر دے گا

ان کے مابین ان تمام چیزوں میں جن میں یہ اختلاف کر رہے ہیں۔‘‘

﴿اِنَّ اللّٰہَ لَا یَھۡدِیۡ مَنۡ ھُوَ کٰذِبٌ کَفَّارٌ ۳﴾ ’’اللہ ہرگز ہدایت نہیں دیتا جھوٹے اور ناشکرے لوگوں کو۔‘‘

آیت ۴ ﴿لَوۡ اَرَادَ اللّٰہُ اَنۡ یَّتَّخِذَ وَلَدًا لَّاصۡطَفٰی مِمَّا یَخۡلُقُ مَا یَشَآءُ ۙ﴾ ’’اگر اللہ کا واقعی ارادہ ہوتا کہ کسی کو اولاد بنائے تو وہ چُن لیتا اپنی مخلوق میں سے جسے چاہتا‘‘

اللہ کی نہ تو کوئی اولاد ہے اور نہ ہی اس کے ہاں اولاد کا کوئی تصور ہے۔ وہ اکیلا خالق ہے اور باقی ہر چیز اس کی مخلوق ہے‘ فرشتے بھی اُس کی مخلوق ہیں۔ اسے کسی کو بیٹا یا بیٹی بنانے کی کوئی ضرورت یا حاجت نہیں ہے۔

﴿سُبۡحٰنَہٗ ؕ ھُوَ اللّٰہُ الۡوَاحِدُ الۡقَھَّارُ ۴﴾ ’’وہ پاک ہے۔ وہ اللہ ہے اکیلا اور (کُل کائنات پر) چھایا ہوا۔‘‘

کُل کائنات اور تمام مخلوقات پر اُس کی حکومت قائم ہے۔ وہ سب پر قابو رکھنے والا اور غالب ہے۔

آیت ۵ ﴿خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ بِالۡحَقِّ ۚ﴾ ’’اُس نے پیدا کیا ہے آسمانوں اور زمین کو حق کے ساتھ۔‘‘

یعنی یہ کائنات ایک نہایت منظّم‘ بامقصد اور نتیجہ خیز تخلیق ہے‘ یہ کوئی کارِ عبث نہیں ہے۔

﴿یُکَوِّرُ الَّیۡلَ عَلَی النَّھَارِ وَیُکَوِّرُ النَّھَارَ عَلَی الَّیۡلِ﴾ ’’وہ رات کو لپیٹ دیتا ہے دن پر اور دن کو لپیٹ دیتا ہے رات پر‘‘

یہ مضمون قرآن حکیم میں تکرار کے ساتھ آیا ہے۔ متعدد مقامات پر یہی الفاظ دہرائے گئے ہیں‘ جبکہ بعض جگہوں پر ﴿یُوۡلِجُ الَّیۡلَ فِی النَّھَارِ وَیُوۡلِجُ النَّھَارَ فِی الَّیۡلِ﴾ کے الفاظ بھی آئے ہیں۔ بہرحال مقصود اس سے یہ حقیقت واضح کرنا ہے کہ رات اور دن کے الٹ پھیر کا یہ منضبط اور منظّم نظام بے مقصد اور عبث نہیں ہے۔ اس حقیقت کو سمجھنے کے لیے عالمِ نباتات کے نظامِ تنفّس (respiration system) کی مثال لی جا سکتی ہے جو کُلّی طور پر دن رات کے ادلنے بدلنے کے ساتھ متعلق و مشروط ہے یا پھر روئے زمین پر پھیلے ہوئے پورے نظامِ زندگی کا حوالہ دیا جا سکتا ہے جو بالواسطہ یا بلاواسطہ طور پر اس گردشِ لیل و نہار کا مرہونِ منت ہے۔ غرض

اس کائنات کی کوئی چیز یا کوئی تخلیق بھی بے مقصد و بے کار نہیں۔ اور اگر ایسا ہے اور یقیناً ایسا ہی ہے تو پھر انسان اور انسان کی تخلیق کیونکر بے مقصد و بے کار ہو سکتی ہے‘ جس کے لیے یہ سب کچھ پیدا کیا گیا ہے؟

یہاں پر ہر ذی شعور انسان کے ذہن میں یہ سوال خود بخود پیدا ہونا چاہیے کہ جب کائنات اور اس کی تمام چیزیں انسان کے لیے پیدا کی گئی ہیں تو آخر انسان کا مقصدِ تخلیق کیا ہے؟ ایک حدیث میں الفاظ آئے ہیں: ((فَاِنَّ الدُّنْیَا خُلِقَتْ لَکُمْ وَاَنْتُمْ خُلِقْتُمْ لِلْاٰخِرَۃِ))(۱) یعنی دنیا تمہارے لیے پیدا کی گئی ہے اور تم آخرت کے لیے پیدا کیے گئے ہو۔ بہرحال اگر عقل اور منطق کی عینک سے بھی دیکھا جائے تو بھی آخرت کے تصور کے بغیر انسان کی تخلیق کا کوئی جواز نظر نہیں آتا۔ خصوصاً انسان کو نیکی اور بدی کا جو شعور ودیعت ہوا ہے وہ ایک ایسی دنیا کا تقاضا کرتا ہے جہاں اچھائی کا نتیجہ واقعی اچھا نکلے اور برائی کا انجام واقعی برا ہو۔ جبکہ اس دنیا میں ہر جگہ اور ہر وقت ایسا ہوتا دکھائی نہیں دیتا۔ چنانچہ انسان کی اخلاقی حس (moral sense) کے نتیجہ خیز ہونے کے لیے بھی ایک دوسری زندگی کا ظہور ناگزیر ہے۔

﴿وَسَخَّرَ الشَّمۡسَ وَالۡقَمَرَ ؕ﴾ ’’اور اُس نے مسخر کر دیا سورج اور چاند کو۔‘‘

﴿کُلٌّ یَّجۡرِیۡ لِاَجَلٍ مُّسَمًّی ؕ﴾ ’’یہ سب کے سب چل رہے ہیں ایک وقت معین تک کے لیے۔‘‘

﴿اَلَا ھُوَ الۡعَزِیۡزُ الۡغَفَّارُ ۵﴾ ’’آگاہ ہو جاؤ! وہ زبردست ہے‘ بہت بخشنے والا۔‘‘

آیت ۶ ﴿خَلَقَکُمۡ مِّنۡ نَّفۡسٍ وَّاحِدَۃٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنۡھَا زَوۡجَھَا﴾ ’’اُس نے پیدا کیا تمہیں ایک جان سے‘ پھر اسی جان سے اس کا جوڑا بنایا‘‘

جو لوگ نظریہ ارتقاء (evolution theory) کو مانتے ہیں یا یہ سمجھتے ہیں کہ قرآن مجید کے ساتھ اس کے بعض اجزاء کی مطابقت ہے‘ وہ اس کی تعبیریں کرتے ہیں کہ ابتدا میں پیدا کیے جانے والے حیوانات (lower animals) میں نر اور مادہ کی تقسیم نہیں تھی۔ جیسے ایبا (Amoeba) ہے جو دو حصوں میں تقسیم ہو کر اپنے جیسے ایک نئے وجود کو جنم دے دیتا ہے۔ اس کے بعد اگلے مرحلے پر ان کا خیال ہے کہ ایسے جانور پیدا کیے گئے جن کے اندر بیک وقت مذکر اور مؤنث دونوں جنسیں (sexes) موجود تھیں۔ جیسے کہ برسات کے موسم میں زمین

(۱) تخریج الاحیاء للعراقی : ۲۵۲/۳

سے نکلنے والے کینچوؤں (earth worms) میں سے ہر ایک کیڑا مذکر و مؤنث دونوں جنسوں کا حامل (hermaphrodite) ہوتا ہے۔ اس کے بعد رفتہ رفتہ دونوں جنسوں میں مزید تفریق ہوئی اور پھر تیسرے مرحلے میں دونوں جنسیں علیحدہ علیحدہ پیدا ہونا شروع ہوئیں۔

﴿وَاَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ الْاَنْعَامِ ثَمٰنِيَةَ اَزْوَاجٍ ؕ﴾ ''اور تمہارے لیے مویشیوں میں سے آٹھ جوڑے اتار دیے''

مویشیوں کے آٹھ جوڑوں کے بارے میں قبل ازیں ہم سورۃ الانعام (آیت ۱۴۳، ۱۴۴) میں بھی پڑھ چکے ہیں۔ ان میں اونٹ نر اور مادہ، گائے نر اور مادہ، بھیڑ نر اور مادہ اور بکری نر اور مادہ آٹھ مویشی شامل ہیں جو اُس وقت عرب میں عموماً پائے جاتے تھے۔

﴿يَخْلُقُكُمْ فِيْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ خَلْقًا مِّنْۢ بَعْدِ خَلْقٍ﴾ ''وہ پیدا کرتا ہے تمہیں تمہارے ماؤں کے پیٹوں میں ایک خلق کے بعد دوسری خلق''

یہاں پر خَلْقًا مِّنْۢ بَعْدِ خَلْقٍ سے تخلیق کے مختلف مراحل مراد ہیں۔ ان مراحل کا ذکر قرآن میں متعدد مقامات پر نُطْفَة، عَلَقَة، مُضْغَة، مُضْغَة مُخَلَّقَة وَّغَيْرِ مُخَلَّقَة اور خَلْقًا اٰخَرَ کے الفاظ سے ہوا ہے۔ البتہ سورۃ المؤمنون کے پہلے رکوع کی آیات اس موضوع پر قرآن کے ذروۂ سنام کا درجہ رکھتی ہیں۔

﴿فِيْ ظُلُمٰتٍ ثَلٰثٍ ؕ﴾ ''(یہ تخلیق ہوتی ہے) تین اندھیروں کے اندر''

ماں کے پیٹ میں بچے کی تخلیق کا یہ عمل تین پردوں کے اندر ہوتا ہے۔ یعنی ایک پردہ تو پیٹ کی بیرونی دیوار (abdominal wall) کا ہے۔ دوسرا پردہ رحم (uterus) کی موٹی دیوار ہے، جبکہ تیسرا پردہ رحم کے اندر کی وہ جھلی (مَشِیمہ) ہے جس کے اندر بچہ لپٹا ہوتا ہے۔ اس میں غور طلب نکتہ یہ ہے کہ تین پردوں کی یہ بات قرآن نے صدیوں پہلے اس وقت کی جس وقت علم جنینیات (Embryology) کے بارے میں انسان کی معلومات نہ ہونے کے برابر تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹر کیتھ ایل مور (جسے ایمبریالوجی پر دنیا بھر میں سند مانا جاتا ہے) نے تسلیم کیا ہے کہ قرآن نے علم جنین کے بارے میں جو معلومات فراہم کی ہیں وہ واقعتاً حیران کن ہیں اور یہ کہ ماں کے پیٹ کے اندر انسانی تخلیق کے مختلف مراحل کی جو تعبیر قرآن نے کی ہے اس سے بہتر تعبیر ممکن ہی نہیں۔ بہرحال اللہ تعالیٰ تین پردوں کے اندر انسان کی تخلیق فرماتا ہے۔ اس کے اعضاء اور اس کی شکل کو جیسے چاہتا ہے بناتا ہے۔

﴿ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ ؕ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ فَاَنّٰى تُصْرَفُوْنَ ۝۶﴾ ''وہ ہے اللہ تمہارا رب، اُسی کی بادشاہی ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، تو تم لوگ کہاں سے پھرائے جا رہے ہو!''

آیت ۷ ﴿اِنْ تَكْفُرُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنْكُمْ ۖ﴾ ''اگر تم کفر کرتے ہو تو یقیناً اللہ تم سے بے نیاز ہے۔''

وہ غنی ہے، اسے تمہاری کوئی احتیاج نہیں، تمہاری طرف سے انکار یا کفرانِ نعمت کی صورت میں اس کی سلطنت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوگی۔

﴿وَلَا يَرْضٰى لِعِبَادِهِ الْكُفْرَ ۚ﴾ ''لیکن وہ اپنے بندوں کے لیے کفر پر راضی نہیں ہے''

اگرچہ اس نے انسان کو اختیار دے رکھا ہے: ﴿اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا ۝۳﴾ (الدھر) کہ تم چاہو تو شکر گزار بندے بنو اور چاہو تو کفرانِ نعمت کی روش اختیار کرو۔ یہ تمہارا اپنا فیصلہ ہے، مگر یہ جان رکھو کہ اسے اپنے بندوں کی طرف سے کفر کا رویہ ہرگز پسند نہیں ہے۔

﴿وَاِنْ تَشْكُرُوْا يَرْضَهُ لَكُمْ ؕ﴾ ''اور اگر تم شکر کرو تو وہ تم سے راضی ہوگا۔''

اگر تم اس کا شکر ادا کرتے رہو، اس کی حمد و ثنا کے ترانے گاتے رہو اور اس کی بندگی کی روش اختیار کیے رکھو تو وہ تم سے خوش رہے گا۔ وہ اسی طرزِ عمل کو پسند کرتا ہے۔

﴿وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ؕ﴾ ''اور نہیں اٹھائے گی بوجھ اٹھانے والی کوئی جان کسی دوسرے کے بوجھ کو۔''

﴿ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ مَّرْجِعُكُمْ﴾ ''پھر تمہارا لوٹنا ہے تمہارے رب ہی کی طرف''

﴿فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ؕ﴾ ''پھر وہ تمہیں بتا دے گا جو کچھ کہ تم کرتے رہے تھے۔''

﴿اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝۷﴾ ''یقیناً وہ جاننے والا ہے سینوں کے اندر چھپی ہوئی باتوں کا۔''

جو راز تمہارے سینوں کے اندر مخفی ہیں وہ ان سے بھی باخبر ہے۔

آیت ۸ ﴿وَاِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ ضُرٌّ دَعَا رَبَّهٗ مُنِيْبًا اِلَيْهِ﴾ ''اور جب انسان کو کوئی

تکلیف پہنچتی ہے تو وہ اپنے رب کو پکارتا ہے اس کی طرف رجوع کرتے ہوئے‘‘

﴿ثُمَّ اِذَا خَوَّلَهٗ نِعْمَةً مِّنْهُ نَسِيَ مَا كَانَ يَدْعُوْٓا اِلَيْهِ مِنْ قَبْلُ﴾ ’’پھر جب وہ عطا کر دیتا ہے اسے کوئی نعمت اپنی طرف سے تو وہ جس چیز کے لیے پہلے اس کے حضور دعائیں کر رہا تھا سب بھول جاتا ہے‘‘

خَوَّلَ کے لفظی معنی اوڑھانے اور لپیٹنے کے ہیں۔ اردو لفظ ’’خول‘‘ اسی سے مشتق ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ اس کے گرد اپنی نعمت کا خول بنا دیتا ہے‘ اسے اپنی نعمت اوڑھا دیتا ہے یا اپنی نعمت کے اندر اسے لپیٹ لیتا ہے۔

﴿وَجَعَلَ لِلّٰهِ اَنْدَادًا﴾ ’’اور وہ اللہ کے مدِمقابل ٹھہرا لیتا ہے‘‘

یعنی اللہ تعالیٰ کی نعمتوں سے بہرہ ور ہونے کے بعد وہ قبل ازاں مانگی ہوئی اپنی دعاؤں کو بھول جانے اور اللہ تعالیٰ سے اعراض کرنے پر ہی بس نہیں کرتا‘ بلکہ اس سے آگے بڑھ کر اللہ کے مدِمقابل جھوٹے معبود بنانے کی جسارت بھی کر گزرتا ہے۔

﴿لِّيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ﴾ ’’تاکہ بہکائے لوگوں کو اُس کے راستے سے۔‘‘

﴿قُلْ تَمَتَّعْ بِكُفْرِكَ قَلِيْلًا ۖ اِنَّكَ مِنْ اَصْحٰبِ النَّارِ ۝۸﴾ ’’(اے نبی ﷺ!) آپ کہہ دیجیے کہ مزے اڑا لو اپنے کفر کے ساتھ تھوڑی دیر‘ یقیناً تم آگ والوں میں سے ہو!‘‘

کفر کی جو روش تم نے اختیار کر رکھی ہے‘ اس کے ساتھ دنیا کی چند روزہ زندگی میں جو عیش کر سکتے ہو کر لو‘ اس کے بعد تمہارا مستقل ٹھکانہ جہنم ہے۔ بالآخر اسی کی آگ میں تمہیں جھونک دیا جائے گا۔

آیات ۹ تا ۲۰

اَمَّنْ هُوَ قَانِتٌ اٰنَآءَ الَّيْلِ سَاجِدًا وَّقَآئِمًا يَّحْذَرُ الْاٰخِرَةَ وَيَرْجُوْا رَحْمَةَ رَبِّهٖ ۭ قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ۭ اِنَّمَا يَتَذَكَّرُ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۝۹ قُلْ يٰعِبَادِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوْا رَبَّكُمْ ۭ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ ۭ وَاَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةٌ ۭ اِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ

بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝۱۰ قُلْ اِنِّيْٓ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ ۝۱۱ وَاُمِرْتُ لِاَنْ اَكُوْنَ اَوَّلَ الْمُسْلِمِيْنَ ۝۱۲ قُلْ اِنِّيْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ۝۱۳ قُلِ اللّٰهَ اَعْبُدُ مُخْلِصًا لَّهٗ دِيْنِيْ ۝۱۴ فَاعْبُدُوْا مَا شِئْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ ۭ قُلْ اِنَّ الْخٰسِرِيْنَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ وَاَهْلِيْهِمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ اَلَا ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِيْنُ ۝۱۵ لَهُمْ مِّنْ فَوْقِهِمْ ظُلَلٌ مِّنَ النَّارِ وَمِنْ تَحْتِهِمْ ظُلَلٌ ۭ ذٰلِكَ يُخَوِّفُ اللّٰهُ بِهٖ عِبَادَهٗ ۭ يٰعِبَادِ فَاتَّقُوْنِ ۝۱۶ وَالَّذِيْنَ اجْتَنَبُوا الطَّاغُوْتَ اَنْ يَّعْبُدُوْهَا وَاَنَابُوْٓا اِلَى اللّٰهِ لَهُمُ الْبُشْرٰى ۚ فَبَشِّرْ عِبَادِ ۝۱۷ الَّذِيْنَ يَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَهٗ ۭ اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ هَدٰىهُمُ اللّٰهُ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمْ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۝۱۸ اَفَمَنْ حَقَّ عَلَيْهِ كَلِمَةُ الْعَذَابِ ۭ اَفَاَنْتَ تُنْقِذُ مَنْ فِي النَّارِ ۚ لٰكِنِ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ لَهُمْ غُرَفٌ مِّنْ فَوْقِهَا غُرَفٌ مَّبْنِيَّةٌ ۙ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۭ وَعْدَ اللّٰهِ ۭ لَا يُخْلِفُ اللّٰهُ الْمِيْعَادَ ۝

آیت ۹ ﴿اَمَّنْ هُوَ قَانِتٌ اٰنَآءَ الَّيْلِ سَاجِدًا وَّقَآئِمًا يَّحْذَرُ الْاٰخِرَةَ وَيَرْجُوْا رَحْمَةَ رَبِّهٖ ۭ﴾ ’’بھلا وہ شخص جو بندگی کرنے والا ہے رات کی گھڑیوں میں‘ سجود و قیام کرتے ہوئے‘ وہ آخرت سے ڈرتا رہتا ہے‘ اور اپنے رب کی رحمت کا امیدوار بھی ہے!‘‘

ان الفاظ کے بعد کی عبارت محذوف ہے اور یہ اسلوب اس سورت میں بار بار آتا ہے۔ آگے چل کر متعدد آیات ایسی ملیں گی جہاں جملوں کو نامکمل چھوڑ دیا گیا ہے کہ سننے یا پڑھنے والا اپنے علم‘ ذہن اور ذوق کے مطابق خود مکمل کر لے۔ چنانچہ یہاں پر کَمَنْ هُوَ غَافِلٌ؟ کے الفاظ سے اس جملے کو مکمل کیا جا سکتا ہے کہ کیا ایک ایسا شخص جو اللہ کا فرمانبردار ہے‘ وہ اپنی راتوں کی گھڑیاں اللہ کے حضور اس کیفیت میں گزارتا ہے کہ کبھی سجدے میں پڑا ہوا ہے اور کبھی حالت قیام میں ہے‘ اس کے دل میں آخرت کا خوف بھی ہے اور اپنے رب کی رحمت کی امید بھی‘ کیا وہ ایک ایسے شخص کے برابر ہو جائے گا جو بالکل غفلت میں پڑا ہوا ہے؟

﴿قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ۭ﴾ ’’(اے نبی ﷺ!) آپ کہہ دیجیے کہ کیا برابر ہو سکتے ہیں وہ لوگ جو علم رکھتے ہیں اور وہ جو علم نہیں رکھتے؟‘‘

﴿اِنَّمَا یَتَذَکَّرُ اُولُوا الۡاَلۡبَابِ ۝۹﴾ ’’حقیقی نصیحت اور سبق تو وہی لوگ حاصل کرتے ہیں جو عقل مند ہیں۔‘‘

آیت ۱۰ ﴿قُلۡ یٰعِبَادِ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوا اتَّقُوۡا رَبَّکُمۡ ؕ﴾ ’’(اے نبی ﷺ!) آپ کہیے کہ اے میرے وہ بندو جو ایمان لائے ہو! اپنے رب کا تقویٰ اختیار کرو۔‘‘

تم لوگ اللہ پر ایمان لائے ہو تو اب تمہیں ہر وقت اللہ کی رضا جوئی کی فکر ہونی چاہیے۔ لہٰذا اللہ جو کام کرنے کا حکم دے وہ کرو اور جس سے وہ منع کرے اس سے باز رہو۔ یہاں پر مسلمانوں کو نبی اکرم ﷺ کی وساطت سے مخاطب کیا گیا ہے۔ یہاں پر یہ نکتہ ایک دفعہ پھر ذہن نشین کر لیں کہ مکی سورتوں میں اہلِ ایمان کو مخاطب کرنے کا یہی انداز ملتا ہے‘ جبکہ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا کے الفاظ سے براہِ راست خطاب کا اسلوب صرف مدنی سورتوں میں پایا جاتا ہے۔ چنانچہ یہاں اہلِ ایمان سے براہِ راست خطاب کرنے کے بجائے حضور ﷺ کو مخاطب کر کے فرمایا گیا ہے کہ اے نبی ﷺ! آپ میری طرف سے میرے اہل ایمان بندوں کو یہ پیغام پہنچا دیں:

﴿لِلَّذِیۡنَ اَحۡسَنُوۡا فِیۡ هٰذِهِ الدُّنۡیَا حَسَنَةٌ ؕ﴾ ’’جو لوگ احسان کی روش اختیار کریں گے‘ ان کے لیے اس دنیا میں بھی بھلائی ہے۔‘‘

﴿وَاَرۡضُ اللّٰهِ وَاسِعَةٌ ؕ﴾ ’’اور اللہ کی زمین بہت وسیع ہے۔‘‘

اگر مکہ میں رہتے ہوئے تمہارے لیے توحید پر کاربند رہنا ممکن نہیں رہا تو یہاں سے ہجرت کر جاؤ۔

﴿اِنَّمَا یُوَفَّی الصّٰبِرُوۡنَ اَجۡرَهُمۡ بِغَیۡرِ حِسَابٍ ۝۱۰﴾ ’’یقیناً صبر کرنے والوں کو ان کا اجر پورا پورا دیا جائے گا بغیر حساب کے۔‘‘

اجر کے حوالے سے یہاں پر یُوَفّٰی کا اصول بھی بتایا گیا ہے اور بِغَیۡرِ حِسَابٍ کی نوید بھی سنائی گئی ہے۔ یعنی پورا پورا بدلہ دینے کے بعد اللہ کا مزید فضل بھی ہوگا۔ اور اللہ تعالیٰ کے فضل کے معاملے میں حساب کا کوئی سوال ہی نہیں!

آیت ۱۱ ﴿قُلۡ اِنِّیۡۤ اُمِرۡتُ اَنۡ اَعۡبُدَ اللّٰهَ مُخۡلِصًا لَّهُ الدِّیۡنَ ۝۱۱﴾ ’’(اے نبی ﷺ!) آپ کہہ دیجیے مجھے تو حکم ہوا ہے کہ میں بندگی کروں اللہ کی اُس کے لیے اپنی اطاعت کو خالص کرتے ہوئے۔‘‘

یہ وہی الفاظ ہیں جو اس سے پہلے آیت ۲ میں بھی آ چکے ہیں۔ یہ مضمون اس سورت کا عمود ہے اور اس میں بار بار آئے گا۔ چنانچہ اس مضمون کی اہمیت کا تقاضا ہے کہ اسے اچھی طرح سمجھ لیا جائے۔ اس حوالے سے بنیادی طور پر یہ نکتہ ذہن نشین کر لیجیے کہ ہر چیز کی طرح عبادت کا بھی ایک ظاہر ہے اور ایک اس کی اصل حقیقت ہے۔ عبادت کا ظاہر اس کی رسومات ہیں۔ ’’رسم‘‘ کسی شے کی ظاہری شکل کو کہا جاتا ہے۔ مثلاً یہ لکھائی میں جو حروف اور الفاظ استعمال ہوتے ہیں ان کی ظاہری اشکال کو ’’رسم‘‘ (رسم الخط) کہتے ہیں۔ جیسے قرآن کا موجودہ رسم الخط ’’رسم عثمانی‘‘ کہلاتا ہے۔ اب اگر نماز کی مثال لیں تو نماز میں کھڑے ہونا‘ اللہ کی حمد و تسبیح کرنا‘ رکوع و سجدہ کرنا مراسم عبادت ہیں۔ بعض دوسرے مذاہب میں اپنے معبود کے سامنے مؤدب کھڑے ہونا‘ سلیوٹ کرنا اور ہاتھ جوڑنا وغیرہ ان کی عبادت کے مراسم ہیں۔ چنانچہ عرف عام میں مراسمِ عبودیت (عبادت کی ظاہری شکل وصورت) کو ہی ’’عبادت‘‘ سمجھا جاتا ہے جبکہ عبادت کی اصل حقیقت کچھ اور ہے۔

اب عبادت کی اصل حقیقت کو یوں سمجھیں کہ یہ بھی دو حصوں پر مشتمل ہے۔ اس کا ایک جسد ہے اور ایک اس کی روح۔ اصل عبادت کا جسد ’’اطاعت‘‘ ہے۔ لیکن عبادت کے حوالے سے اطاعت کے مفہوم کو سمجھنے کے لیے لفظ ’’عبادت‘‘ کے لغوی معنی کو ذہن میں رکھنا ہوگا۔ عبادت کا لفظ ’’عبد‘‘ سے مشتق ہے اور عبد کے معنی غلام کے ہیں۔ عبد یا غلام اپنے آقا کی ہمہ تن اور ہمہ وقت اطاعت (غلامی) کا پابند ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں اس سے پہلے ہم یہ لفظ دو مرتبہ غلامی اور کُلّی اطاعت کے معنی میں پڑھ چکے ہیں۔ سورۃ المؤمنون میں حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کے بارے میں فرعون کا یہ قول نقل ہوا ہے: ﴿وَقَوۡمُهُمَا لَنَا عٰبِدُوۡنَ ۝۴۷﴾ کہ ان کی قوم تو ہماری غلام ہے۔ اسی طرح سورۃ الشعراء میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اس مکالمے کا حوالہ آ چکا ہے جس میں آپؑ نے فرعون کو مخاطب کر کے فرمایا تھا: ﴿وَتِلۡکَ نِعۡمَةٌ تَمُنُّهَا عَلَیَّ اَنۡ عَبَّدۡتَّ بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ ۝۲۲﴾ ’’اور یہ احسان جو تو مجھے جتلا رہا ہے (کیا یہ اس کا بدلہ ہے) کہ تو نے بنی اسرائیل کو غلام بنا رکھا ہے؟‘‘ اب ظاہر ہے بنی اسرائیل فرعون یا قبطیوں کی پرستش یا پوجا تو نہیں کرتے تھے‘ وہ ان کی نماز نہیں پڑھتے تھے اور انہیں سجدہ بھی نہیں کرتے تھے۔ البتہ وہ ان کے غلام تھے اور اس حیثیت میں ان کی ’’اطاعت‘‘ کے پابند تھے۔ لہٰذا متذکرہ بالا دونوں آیات میں عبد کا لفظ کُلّی اطاعت یا غلامی کے مفہوم میں ہی استعمال ہوا ہے۔ چنانچہ اطاعت یا

غلامی دراصل عبادت کا جسد ہے جبکہ اس کی روح ''محبت'' ہے۔ یعنی اگر کسی کی محبت کے جذبے سے سرشار ہو کر اس کی اطاعت کی جائے تو وہ اس کی عبادت ہوگی' جبکہ جبری اطاعت عبادت نہیں ہو سکتی۔ مثلاً ۱۹۴۷ء سے پہلے برصغیر میں ہم لوگ انگریز کی اطاعت کرتے تھے' لیکن ہماری اس اطاعت کو عبادت نہیں کہا جا سکتا' اس لیے کہ یہ جبری اطاعت تھی۔

امام ابن تیمیہؒ اور ان کے شاگرد حافظ ابن قیمؒ نے عبادت کی تعریف یوں کی ہے: **العبادة تجمع اَصْلَین : غایةَ الحُبِّ مع غایة الذُّلِّ والخُضوع** یعنی اللہ کی عبادت دو چیزوں کے مجموعے کا نام ہے: اس کے ساتھ غایت درجے کی محبت اور اس کے سامنے غایت درجے کا تذلّل اور عاجزی کا اظہار۔ دوسرے لفظوں میں اللہ کی عبادت کا مطلب یہ ہے کہ انسان حد درجے کی محبت کے ساتھ خود کو اللہ کے سامنے بچھا دے اور اس کا مطیع و منقاد ہو جائے۔ چنانچہ اللہ کی محبت کے جذبے سے سرشار ہو کر اس کی کُلی اطاعت کرنا اصل عبادت ہے' جبکہ مراسمِ عبادت کی حیثیت عبادت کے ''ظاہر'' کی ہے۔

آیت زیر مطالعہ کا مضمون گویا اس سورت کا عمود ہے کہ اللہ کی عبادت کرو اُس کے لیے اپنی اطاعت کو خالص کرتے ہوئے۔ اس ضمن میں یہ نکتہ بہت اہم ہے کہ اللہ کی اطاعت سے آزاد کسی دوسرے کی مستقل بالذات اطاعت تو شرک ہے ہی' لیکن اگر کسی نے اللہ کی اطاعت کے ساتھ کسی اور کی اطاعت کو بھی شریک کر لیا تو ایسی جزوی یا مشترکہ اطاعت اللہ کو قبول نہیں۔ ایسی اطاعت اللہ کی طرف سے ایسے اطاعت گزار کے منہ پر دے ماری جائے گی۔ اس حوالے سے سورۃ البقرۃ کی آیت ۲۰۸ کا یہ حکم بہت واضح ہے: ﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِی السِّلْمِ كَآفَّةً ۪﴾ ''اے اہل ایمان! اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ!'' یعنی اللہ کو کُلّی اطاعت مطلوب ہے۔ کسی کی پچیس فی صد' پچاس فی صد یا پچھتّر (۷۵) فی صد اطاعت اسے قبول نہیں۔

یہ تو ہے عبادت کی اصل روح اور اطاعت کی اصل کیفیت جو اللہ کو مطلوب ہے۔ لیکن ایک ہم ہیں جو یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ ہم پانچ یا دس فیصد اطاعت پر ہی اللہ کو (نعوذ باللہ) ٹرخا دیں گے اور وہ اسی معیار کی اطاعت پر ہمیں جنت اور اس کی نعمتوں سے نواز دے گا۔ دراصل ہماری اسی ٹیڑھی سوچ کی وجہ سے آج ہمارے ذہنوں سے زندگی کے تمام گوشوں میں اللہ کی کلی اطاعت اور کلی بندگی کا تصور نکل چکا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور بندگی کے اسی تصور کو زیر مطالعہ سورتوں میں ایک خاص ترتیب سے اجاگر کیا گیا ہے۔ اس طرح کہ اس مضمون کی جڑیں اس پہلی سورت میں ملیں گی اور اس کی چوٹی چوتھی سورت یعنی سورۃ الشوریٰ میں جا کر نظر آئے گی۔

آیت ۱۲ ﴿وَاُمِرْتُ لِاَنْ اَكُوْنَ اَوَّلَ الْمُسْلِمِیْنَ ۝۱۲﴾ ''اور مجھے حکم ہوا ہے کہ سب سے پہلا فرماں بردار میں خود بنوں۔''

ایسا ممکن نہیں کہ میں تم لوگوں کو تو اللہ کی فرماں برداری کی دعوت دوں اور خود مجھے اس کی پروانہ ہو۔

آیت ۱۳ ﴿قُلْ اِنِّیْۤ اَخَافُ اِنْ عَصَیْتُ رَبِّیْ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ ۝۱۳﴾ ''کہہ دیجیے کہ مجھے خود اندیشہ ہے ایک بڑے دن کے عذاب کا اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں۔''

میں خود بھی تو اللہ کا بندہ ہوں' اور اس حیثیت سے اس کی کُلّی اطاعت کا پابند ہوں۔ اس ضمن میں میرے لیے کوئی استثناء نہیں' اور اگر بالفرض میں بھی اپنے رب کی نافرمانی کروں تو مجھے بھی اللہ کے عذاب کا اندیشہ ہوگا۔ یہ شرطیہ فقرہ ہے اور یوں سمجھیں کہ اس کے درمیان کا ''اگر'' گویا ایک پہاڑ ہے جسے پھلانگنا ناممکنات میں سے ہے۔ دراصل یہ انداز مخالفین کو معاملے کی سنجیدگی کا احساس دلانے کے لیے اختیار فرمایا گیا ہے' ورنہ حضور ﷺ کے لیے اس کا ہرگز کوئی امکان نہیں تھا۔

آیت ۱۴ ﴿قُلِ اللّٰهَ اَعْبُدُ مُخْلِصًا لَّهٗ دِیْنِیْ ۝۱۴﴾ ''کہہ دیجیے کہ میں تو اللہ ہی کی بندگی کرتا ہوں اس کے لیے اپنی اطاعت کو خالص کرتے ہوئے۔''

نوٹ کیجیے! اس مضمون کو یہاں بار بار دہرایا جا رہا ہے۔ اور ہر بار پڑھنے سے اس میں ایک نیا حسن نظر آتا ہے اور ایک نئی تاثیر کا احساس ہوتا ہے۔ جب کہ ہم انسانوں کی دنیا میں کسی عبارت کے اندر الفاظ یا مضمون کی تکرار' اس تحریر یا تصنیف کا بہت بڑا عیب بن جاتا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کے کلام کی فصاحت و بلاغت کا معجزہ ہے کہ اس کے ہاں تکرار سے کلام کا حسن اور بھی بڑھ جاتا ہے۔ یہاں اس مضمون کی غیر معمولی تکرار کی غرض و غایت کو سمجھنے اور اس اسلوبِ خاص میں تاکید (emphasis) کی شدت کو محسوس کرنے کی بھی ضرورت ہے۔ اس کے لیے سورت کے آغاز سے لے کر آیت زیر مطالعہ تک مذکورہ مضمون سے متعلقہ آیات کو ایک مرتبہ پھر سے ذہن میں تازہ کر لیجیے۔ آغاز میں فرمایا گیا: ﴿اِنَّاۤ اَنْزَلْنَاۤ اِلَیْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ فَاعْبُدِ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّیْنَ ۝۲ اَلَا لِلّٰهِ الدِّیْنُ الْخَالِصُ ؕ﴾ ''(اے نبی ﷺ!) ہم نے آپ پر یہ کتاب اتاری ہے حق کے ساتھ' پس بندگی کرو اللہ کی اس کے لیے اپنی اطاعت کو خالص کرتے ہوئے۔ آگاہ ہو جاؤ کہ اطاعتِ خالص اللہ ہی کا حق ہے''۔ اس کے بعد آیت ۱۱ ملاحظہ کیجیے: ﴿قُلْ اِنِّیْۤ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّیْنَ ۝۱۱﴾ ''(اے نبی ﷺ!) آپ کہہ دیجیے

مجھے حکم ہوا ہے کہ میں بندگی کروں اللہ کی اُس کے لیے اطاعت کو خالص کرتے ہوئے''۔ اور اب زیر مطالعہ آیت کا مضمون دیکھئے: ﴿قُلِ اللّٰهَ اَعْبُدُ مُخْلِصًا لَّهٗ دِيْنِيْ ﴿۱۴﴾﴾ ''کہہ دیجیے کہ میں تو اللہ ہی کی بندگی کرتا ہوں اُس کے لیے اپنی اطاعت کو خالص کرتے ہوئے''۔ گویا تکرار پر تکرار ہے' اصرار پر اصرار ہے اور تاکید پر تاکید ہے۔

آیت ۱۵ ﴿فَاعْبُدُوْا مَا شِئْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ ؕ﴾ ''تو تم جس کو چاہو پوجو اُس کے سوا!''

﴿قُلْ اِنَّ الْخٰسِرِيْنَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ وَاَهْلِيْهِمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ﴾ ''آپؐ کہہ دیجئے کہ اصل میں خسارے میں رہنے والے وہی لوگ ہوں گے جنہوں نے اپنے آپ کو اور اپنے اہل وعیال کو خسارے میں ڈالا قیامت کے دن۔''

یہاں پر تو وہ حرام خوری کے ذریعے خود بھی مزے میں ہیں اور اپنے اہل وعیال کو بھی عیش و عشرت کا سامان مہیا کر رہے ہیں۔ لیکن اس روش کو اپنا کر وہ اپنے اور اپنے اہل وعیال کے ساتھ کوئی بھلائی یا خیر خواہی نہیں کر رہے بلکہ حقیقت میں وہ خود کو اور ان کو جہنم کا ایندھن بنانے کے اسباب پیدا کر رہے ہیں۔ سورۃ التحریم' آیت ۶ میں اہل ایمان کو اس حوالے سے خصوصی طور پر حکم دیا گیا ہے: ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا.....﴾ ''اے اہل ایمان! بچاؤ اپنے آپ کو اور اپنے اہل وعیال کو جہنم کی آگ سے.....'' لیکن اس کے برعکس جو شخص خود کو اور اپنے اہل وعیال کو جہنم کی آگ کا مستحق بنا لے اس سے بڑھ کر اور کون گھاٹے میں ہوگا!

﴿اَلَا ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِيْنُ ﴿۱۵﴾﴾ ''آگاہ ہو جاؤ یہی تو کھلا خسارا ہے۔''

آیت ۱۶ ﴿لَهُمْ مِّنْ فَوْقِهِمْ ظُلَلٌ مِّنَ النَّارِ وَمِنْ تَحْتِهِمْ ظُلَلٌ ؕ﴾ ''اُن کے لیے ان کے اوپر سے بھی آگ کے بادل ہوں گے تہہ بر تہہ اور نیچے سے بھی آگ کے بھبکے ہوں گے تہہ بر تہہ۔''

﴿ذٰلِكَ يُخَوِّفُ اللّٰهُ بِهٖ عِبَادَهٗ ؕ﴾ ''یہ وہ شے ہے جس سے اللہ ڈراتا ہے اپنے بندوں کو۔''

﴿يٰعِبَادِ فَاتَّقُوْنِ ﴿۱۶﴾﴾ ''اے میرے بندو! پس تم مجھ سے ڈرو۔''

میری ان وعیدوں سے ڈر کر تم اپنے آپ کو جہنم کی آگ سے بچانے کی کوشش کرو۔

آیت ۱۷ ﴿وَالَّذِيْنَ اجْتَنَبُوا الطَّاغُوْتَ اَنْ يَّعْبُدُوْهَا﴾ ''اور وہ لوگ جنہوں نے طاغوت سے کنارہ کشی کر لی (اس طرح) کہ اُس کی بندگی نہ کی''

طاغوت کا لفظ قرآن میں متعدد بار آیا ہے۔ سب سے پہلے ہم نے یہ لفظ سورۃ البقرۃ کی اس آیت میں پڑھا تھا: ﴿فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى ﴿۲۵۶﴾﴾ (آیت ۲۵۶) ''تو جو کوئی بھی طاغوت کا انکار کرے اور پھر اللہ پر ایمان لائے تو اس نے بہت مضبوط حلقہ تھام لیا''۔ لفظ طاغوت کا مادہ ''طغی'' ہے اور اس کے معنی سرکشی کے ہیں۔ اسی مادہ سے اردو لفظ ''طغیانی'' مشتق ہے۔ دریا اپنے کناروں کے اندر بہہ رہا ہو تو بہت خوبصورت منظر پیش کرتا ہے لیکن جب وہ اپنی ''حدود'' سے باہر نکل آئے تو ہم کہتے ہیں کہ دریا میں طغیانی آ گئی ہے۔ اسی طرح انسان اگر اللہ کی بندگی کی حد میں رہے تو وہ اللہ کا بندہ ہے' اُس کا خلیفہ ہے اور اشرف المخلوقات ہے۔ لیکن اگر بندگی کی حدود سے تجاوز کر جائے تو وہ ''طاغوت'' ہے۔ پھر چاہے ان حدود کو پھلانگنے کے بعد وہ اپنے نفس کا بندہ بن جائے یا کسی اور کو اپنا مطاع بنا لے' خود حاکم بن بیٹھے یا اللہ کے علاوہ کسی اور کی حاکمیت کا طوق اپنے گلے میں ڈال لے' اللہ کی نظر میں وہ طاغوت ہی ہے۔ چنانچہ آیت زیر مطالعہ میں ان لوگوں کا ذکر ہے جنہوں نے کنارہ کشی کر لی اس سے کہ وہ طاغوت کی اطاعت یا بندگی کریں:

﴿وَاَنَابُوْٓا اِلَى اللّٰهِ لَهُمُ الْبُشْرٰى ۚ فَبَشِّرْ عِبَادِ ﴿۱۷﴾﴾ ''اور انہوں نے رجوع کر لیا اللہ کی طرف' اُن کے لیے بشارت ہے' تو (اے نبی ﷺ!) میرے ان بندوں کو بشارت دے دیجیے۔''

اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا اجْعَلْنَا مِنْھُمْ ! اب اگلی آیت بہت اہم ہے' اس میں ان بندوں کی صفت بیان کی گئی ہے جنہیں بشارت دی جا رہی ہے۔

آیت ۱۸ ﴿الَّذِيْنَ يَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَهٗ ؕ﴾ ''جو بات کو توجہ سے سنتے ہیں' پھر اس کے بہترین پہلو کی پیروی کرتے ہیں۔''

یعنی یہ دین جس کی طرف اللہ تمہیں بلا رہا ہے اس کے بھی مختلف مدارج ہیں۔ پہلا درجہ اسلام ہے' اس سے اونچا درجہ ایمان اور پھر سب سے اونچا درجہ احسان ہے۔ درجہ احسان پر فائز لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے ﴿وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۹۳﴾﴾ (المائدۃ) کی بشارت سنائی ہے۔ چنانچہ ہمیں چاہیے کہ دین کے معاملے میں زیادہ سے زیادہ محنت کریں اور ہر لمحہ بہتر سے بہتر درجے پر پہنچنے کی فکر میں رہیں۔ لیکن بدقسمتی سے ہمارا طرزِ عمل اس کے برعکس ہے۔ دُنیوی معاملات میں تو ہمارا ماٹو بقول حالی یہ ہے کہ: ؎

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں　　اب دیکھئے ٹھہرتی ہے جا کر نظر کہاں!

جبکہ دین کے معاملے میں نہ صرف یہ کہ ہم کم سے کم پر گزارا کرنا چاہتے ہیں بلکہ پسپائی اختیار کرنے کی فکر میں ہر وقت کسی گنجائش اور رعایت کی تلاش میں رہتے ہیں۔ حالانکہ ایک بندۂ مؤمن کو چاہیے کہ دنیا کے معاملے میں تو کم سے کم پر گزارا کرے اور دین کے معاملے میں ہمیشہ عزیمت کا راستہ اختیار کرنے کی فکر میں رہے۔

﴿اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدٰىهُمُ اللّٰهُ وَاُولٰٓئِكَ هُمْ اُولُوا الْاَلْبَابِ ﴿۱۸﴾﴾ ''یہی وہ لوگ ہیں جنہیں اللہ نے ہدایت دی ہے اور یہی وہ لوگ ہیں جو عقل مند ہیں۔''

آیت ۱۹ ﴿اَفَمَنْ حَقَّ عَلَيْهِ كَلِمَةُ الْعَذَابِ ؕ﴾ ''تو کیا وہ شخص جس پر ثابت ہو چکا ہے عذاب کا فیصلہ!''

اس کے بعد یہ جملہ گویا محذوف ہے: كَمَنْ هُوَ فِي الْجَنَّةِ؟ یعنی جو شخص عذاب کا مستحق ہو چکا ہے کیا وہ اس شخص کے برابر ہو جائے گا جو کہ جنت میں جانے والا ہے؟

﴿اَفَاَنْتَ تُنْقِذُ مَنْ فِي النَّارِ ﴿۱۹﴾﴾ ''تو (اے نبی ﷺ!) کیا آپ اُس کو بچا سکیں گے جو آگ میں ہے؟''

یہ وہ لوگ ہیں جو عذاب سے متعلق اللہ کے قانون کی زد میں آ چکے ہیں۔ اتمامِ حجت ہو جانے کے بعد ان کے دلوں پر مہریں لگا دی گئی ہیں۔ وہ گمراہی میں اس حد تک آگے جا چکے ہیں کہ اب ایمان کی طرف ان کی واپسی کا کوئی امکان نہیں۔ چنانچہ اب وہ آگ کا ایندھن بننے والے ہیں اور اس مرحلے پر آپؐ ان کو اس بھیانک انجام سے نہیں بچا سکتے۔

آیت ۲۰ ﴿لٰكِنِ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ لَهُمْ غُرَفٌ مِّنْ فَوْقِهَا غُرَفٌ مَّبْنِيَّةٌ ۙ﴾ ''لیکن وہ لوگ جو اپنے رب کا تقویٰ اختیار کرتے ہیں ان کے لیے ہوں گے بالا خانوں پر بالا خانے (ایک دوسرے کے اوپر) چُنے ہوئے۔''

اللہ تعالیٰ انہیں جنت میں کئی کئی منزلہ رہائش گاہیں (skyscrapers) عطا فرمائے گا۔

﴿تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ؕ﴾ ''ان کے دامن میں ندیاں بہتی ہوں گی۔''

﴿وَعْدَ اللّٰهِ ؕ لَا يُخْلِفُ اللّٰهُ الْمِيْعَادَ ﴿۲۰﴾﴾ ''یہ اللہ کا وعدہ ہے، اللہ اپنے وعدے کی خلاف ورزی نہیں کرتا۔'' ❁❁❁

اَنْ اَقِیْمُوا الدِّیْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِیْهِ

انجینئر محمد رشید عمر

جس طرح یہ ایک اٹل حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذاتِ رفیع اس کائنات کی مالک ہے اور اسی کا حکم اس میں جاری وساری ہے' ایک ایک ذرہ اس کے حضور سرنگوں اور اس کی حمد میں رطب اللسان ہے' اسی طرح ہم انسانوں پر لازم ہے کہ اُسی کے دیے ہوئے نظامِ زندگی یعنی اسلام کے مطابق زندگی گزاریں۔ اُس پاک ہستی کے لیے اس کے علاوہ کوئی دوسرا نظامِ زندگی ہرگز قابلِ قبول نہیں ہے۔

﴿وَمَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْهُ ۚ وَهُوَ فِی الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ﴿۸۵﴾﴾ (آل عمران)

''جو کوئی اسلام کے علاوہ کوئی دین اختیار کرنا چاہے گا تو اس سے ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا' اور آخرت میں وہ خسارہ پانے والوں میں سے ہو کر رہے گا۔''

شیطانِ لعین نے ہمیشہ اس نظام سے سرکشی اور بغاوت پر انسان کو اکسایا ہے اور اس مقصد کے لیے اس نے نئی سے نئی چالوں سے کام لیا ہے۔ جب بھی اللہ کے بندوں نے اس کام کے لیے کمر کسی ہے تو شیطان نے اس کام کی اہمیت سے توجہ ہٹانے کے لیے اپنے چیلوں کے ذریعے ملمع شدہ متوازی منصوبے شروع کروا دیے ہیں اور اس کام پر یکسو ہونے والوں کی فکر کو پراگندہ کرنے کی کوشش کی ہے۔

آج اس دور کے فتنوں میں فتنہ غامدیت بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ اس کا بیانیہ یہ ہے کہ مذہب کا ریاست سے کوئی تعلق نہیں ہے' یہ انسان کا انفرادی معاملہ ہے۔ اسی کا شاخسانہ یہ بیانیہ ہے کہ فقہ اسلامی میں اقامتِ دین کی جدّوجُہد فرضِ عین کا مقام نہیں رکھتی۔ غور طلب بات یہ ہے کہ اگر دین کا قیام اور نفاذ فرضِ عین نہیں ہے تو پھر اس دین کے اندر دوسرے فرائض کی اہمیت کیا رہ جاتی ہے؟ مثال کے طور پر ایک آدمی نے ہمارے سامنے یہ بیان دیا کہ بہاول پور

میں فلاں سال' فلاں مہینے کی فلاں تاریخوں میں ہونے والے اجتماع میں فیصل آباد سے اتنے لوگوں نے شرکت کی تھی۔ اس میں فیصل آباد کے لوگوں کی شمولیت اس بات کی مستلزم ہے کہ اجتماع کا منعقد ہونا ثابت ہو۔ اگر یہ کہہ دیا جائے کہ اس سال میں اجتماع منعقد ہی نہیں ہوا تھا تو پھر شرکت کے دعوے کی کیا صداقت رہ جاتی ہے؟ تو دین کے فرائض کا پرچار کرنے والوں کی زبانیں اگر یہ کہنا شروع کر دیں کہ دین کا قیام فرضِ عین نہیں ہے تو ایسے دینی فرائض کا پرچار کرنے والوں کے دعووں کی سچائی کے لیے کیا بنیاد باقی رہ جاتی ہے؟ ایسی سوچیں اور فکریں کیوں جنم لے رہی ہیں؟ ممکنہ اسباب یہ ہو سکتے ہیں۔

(۱) شاید فقہی مباحث میں دوٹوک الفاظ میں اقامت دین کے قیام کی فرضیت کا کوئی باب نہیں ہے۔

(۲) یہ سوچ کہ انسان کی مساعی کا مقصد نجاتِ اُخروی ہے اور دین اس اعتبار سے فرد کی اصلاح کا کام کرتا ہے۔

(۳) فتنۂ عالمگیریت کے دباؤ (Constraints of Globalization)

آیئے' ان اسباب کا ایک ایک کر کے جائزہ لیتے ہیں۔

فقہ نام ہے ان علوم کا کہ دین اسلام میں ایک فرد کے لیے کیا ہے اور اس کے اوپر ذمہ داریاں کیا ہیں۔ گویا اسلام کے گنبد میں بیٹھ کر ان باتوں کو طے کیا گیا ہے۔ اگر کوئی اس عمارت کے لزوم کا انکار کر دے گا تو بقیہ معاملات کا کیا مقام اور حیثیت رہ جائے گی؟ کیا انسان کے لیے مالہ و ماعلیہ کا تصور دین اسلام سے کوئی باہر کا معاملہ ہے؟ انسان کی سب سے بڑی ضرورت عدل و انصاف کی فراہمی ہے' جو دین اسلام کی منفرد خوبی ہے۔ اس کے مطابق جزا اور سزا کا نظام کیا اس کے قیام کے بغیر ممکن ہے؟ ارشادِ باری تعالیٰ اس بات پر دلیل قاطع ہے:

﴿لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَیِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِیْزَانَ لِیَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ﴾ (الحدید: ۲۵)

''ہم نے بھیجا اپنے رسولوں کو واضح نشانیوں کے ساتھ اور ہم نے ان کے ساتھ کتاب اور میزان اتاری تاکہ لوگ انصاف پر قائم ہوں۔ اور ہم نے لوہا بھی اتارا ہے' اس میں شدید جنگی صلاحیت ہے اور لوگوں کے لیے دوسری منفعتیں بھی ہیں' تاکہ اللہ جان لے

کہ کون مدد کرتا ہے اُس کی اور اُس کے رسولوں کی غیب میں ہونے کے باوجود۔ یقیناً اللہ بہت قوت والا بہت زبردست ہے۔‘‘

جس طرح روزوں کی فرضیت کا ذکر قرآن مجید میں ایک جگہ آیا ہے‘ دین میں اس کے لزوم کی تاریخی شہادت اور متعلقہ احکام ایک مقام پر بیان ہوئے ہیں‘ بالکل اسی طرح اقامت دین کی فرضیت کا حکم سورۃ الشوریٰ میں ایک ہی بار اس کے لزوم کی تاریخی شہادت کے ساتھ دیا گیا ہے۔ دین کے قیام کی ذمہ داری کو ادا کرنے کے لیے کیا تقاضے ہیں‘ وہ پوری سورۃ میں شرح وبسط کے ساتھ بیان کر دیے گئے ہیں۔ اس سورۃ کی مندرجہ ذیل آیات پر غور وفکر کیجیے:

(۱) ﴿وَالَّذِيْنَ يُحَآجُّوْنَ فِي اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا اسْتُجِيْبَ لَهٗ حُجَّتُهُمْ دَاحِضَةٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ وَّلَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ﴿۱۶﴾ اَللّٰهُ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ وَالْمِيْزَانَ ۭ وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّ السَّاعَةَ قَرِيْبٌ ﴿۱۷﴾﴾

’’جو لوگ اللہ کے بارے میں حجت بازی میں لگے رہے اس کے بعد کہ اس کی دعوت پر لبیک کہہ دیا گیا ہے‘ ان کی حُجّت بازی ان کے رب کے ہاں بالکل پسپا ہے‘ ان پر اللہ کا غضب ہے اور ان کے لیے بہت سخت عذاب ہے۔ اللہ ہی ہے جس نے اتاری ہے کتاب بھی حق کے ساتھ اور میزان بھی۔ اور تمہیں کیا معلوم کہ قیامت قریب ہی ہو!‘‘

(۲) ﴿اِسْتَجِيْبُوْا لِرَبِّكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا مَرَدَّ لَهٗ مِنَ اللّٰهِ ۭ مَا لَكُمْ مِّنْ مَّلْجَاٍ يَّوْمَىِٕذٍ وَّمَا لَكُمْ مِّنْ نَّكِيْرٍ ﴿۴۷﴾﴾ (الشوریٰ)

’’(اے ایمان والو!) اپنے رب کی پکار پر لبیک کہو اس سے پہلے کہ اللہ کے حکم سے وہ دن آجائے جسے لوٹایا نہ جائے گا۔ نہیں ہوگی تمہارے لیے اُس دن کوئی جائے پناہ اور نہیں ہوگا تمہارے لیے کوئی موقع انکار کا۔‘‘

ان آیات سے دو باتیں چاند سورج کی طرح عیاں ہو رہی ہیں:

(۱) جو لوگ اقامتِ دین کی فرضیت کا انکار یا اس کے موقف میں کسی طرح کا اخفاف کرنا چاہ رہے ہیں اللہ کے نزدیک ان کی بات لایعنی ہے۔

(۲) اس کتاب کی بنیاد پر میزانِ عدل کے قیام کی مساعی کی پکار پر قیامت سے پہلے پہلے لبیک کہنا ہوگا۔ دوسرے لفظوں میں اس کام کے لیے ہمیں قیامت تک کا وقفہ دیا گیا ہے۔ ہماری مساعی کا ہدف اقامتِ دین ہوگا تو ہم اس دن اس کی پناہ کا فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

بصورتِ دیگر اللہ کی نظر میں ہمارا کوئی مقام نہ ہوگا۔

تو وہ حضرات جنہوں نے دین میں تفقّہ حاصل کیا اور پھر اس کو بیان کیا‘ ان سے اگر سوال کیا جاتا کہ دین کی اقامت کی فرضیت کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ تو کیا امام ابوحنیفہؒ اس کا انکار کر دیتے؟ ان حضرات کے متعلق ایسا سوچا بھی نہیں جا سکتا۔ امام ابوحنیفہؒ جن کو وقت کے حکمران نے اس عہدے کی پیش کش کی کہ میرا کوئی حکم آپ کے دستخط کے بغیر نافذ العمل نہیں ہوگا تو انہوں نے یہ کہہ کر اس کا انکار کر دیا کہ قتل تم کرو گے اور اس کے جواز پر دستخط میرے ہوں گے —— مجھے یہ عہدہ ہرگز قابل قبول نہیں ہے۔ ان اور ان جیسی دوسری شخصیات کے متعلق کیا یہ سوچا جا سکتا ہے کہ وہ اقامت دین کی فرضیت عین کے قائل نہ ہوں گے؟ آج ایسے مکالمہ باز پیدا ہو گئے ہیں جن کا فقہ سازی میں یا فقہی تعلیم میں کوئی قابل قدر حصہ بھی نہیں ہے‘ وہ اپنے مزعومہ فقہی دلائل سے ان عظیم شخصیتوں کے کردار کو داغدار کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یہ فقہ کا قصور نہیں‘ فقہی مسائل کا سہارا لینے والوں کی کوتاہ نظری کا اظہار ہے‘ جس کو بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمدؒ نے اپنی کتاب ’’اسلام کے انقلابی فکر کی تجدید وتعمیل اور اس سے انحراف کی راہیں‘‘ میں اس فکر سے انحراف کے اسباب میں بڑا سبب قرار دیا ہے۔

دوسری بات یہ کہ دین کا مخاطب فرد ہے‘ یہ اس کی اصلاح پر زور دیتا ہے اور فرد کی زندگی کی جدوجہد کا مقصد نجاتِ اُخروی ہے۔ اقامتِ دین کے لیے قائم ہونے والی جماعت اس مقصد کے حصول کے لیے اس کی مدد ومعاون ہے۔ یہ فکر اقامتِ دین کی جدوجہد کو اُس وقت پس منظر میں لے جاتی ہے جب یہ سمجھ لیا جائے کہ فرد کی اصلاح اور اقامتِ دین کی جدوجہد دو مختلف کام ہیں یا ان میں کوئی مغائرت ہے‘ جبکہ ایسا ہرگز نہیں ہے۔ فرد کی اصلاح ہی یہ ہے کہ وہ نہ صرف اپنے چھ فٹ کے جسم پر اللہ کے دین کو نافذ کرے‘ بلکہ بقیہ کُرّۂ ارضی پر دوسرے ادیان کو مغلوب کر کے دین اسلام کی بالادستی قائم کرنے کی جِدّوجُہد کرے۔ چنانچہ یہ کہنا کہ دین اسلام کا مخاطب فرد ہے اور یہ اس کی اصلاح چاہتا ہے تاکہ اُخروی فلاح حاصل کر سکے‘ یا یہ کہنا کہ کُرّۂ ارضی پر اللہ کا دین غالب کرنا منشاء خداوندی ہے‘ دونوں باتوں میں سرے سے کوئی فرق ہی نہیں ہے۔

دوسرے لفظوں میں ایک اصلاح یافتہ شخص کا وجود میں آنا ہی اقامتِ دین کی جدوجہد کا

نقطہ آغاز ہے۔ اس کے کوئی دوسرے معانی اخذ کرنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی اس آیت مبارکہ ﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا عَلَیْكُمْ اَنْفُسَكُمْ ۚ لَا یَضُرُّكُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَیْتُمْ ؕ﴾ (المائدۃ: ۱۰۵) ''اے ایمان والو! تمہیں اپنی فکر لازم ہے، اگر تم ہدایت پر ہو تو کوئی گمراہ تمہیں نقصان نہیں پہنچا سکتا'' کے یہ معانی اخذ کر لے کہ ''تجھ کو پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تو!'' ایسے معانی اخذ کرنے والوں کے متعلق حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا تھا کہ لوگو! میں دیکھ رہا ہوں تم اس آیت کا غلط مطلب سمجھ رہے ہو۔ اس کا مطلب تو یہ ہے کہ تمہاری ساری تبلیغ، کوشش، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے باوجود اگر کوئی شخص گمراہ رہتا ہے تو اس کا تم پر کوئی وبال نہیں۔

تفسیر عثمانی میں اس آیت کی یوں وضاحت فرمائی گئی ہے: ''.....سیدھی راہ یہ ہی ہے کہ آدمی ایمان وتقویٰ اختیار کرے، خود برائی سے رکے اور دوسروں کو روکنے کی امکانی کوشش کرے۔ پھر بھی لوگ برائی سے نہ رکیں تو اس کا کوئی نقصان نہیں۔ اس آیت سے یہ سمجھ لینا کہ جب ایک شخص اپنا نماز روزہ ٹھیک کر لے تو امر بالمعروف چھوڑ دینے سے اسے کوئی مضرت نہیں ہوتی، سخت غلطی ہے۔ لفظ ''اھتداء'' امر بالمعروف وغیرہ تمام وظائف ہدایت کو شامل ہے۔''

رسول اللہ ﷺ اور آپؐ کے اصحاب کی پوری سیرت اس عمل کی شاہد عادل ہے۔ آج اگر کوئی شخص کہتا ہے کہ فقہ نے اس جدوجہد کو فرضِ عین قرار نہیں دیا تو یہ شخص گویا فقہاء کو رسول کے درجے پر رکھ رہا ہے۔ حقیقت میں یہ شخص فقہائے دین پر تہمت لگا رہا ہے کہ وہ اقامتِ دین کی جدوجہد کے قائل نہیں تھے۔ دوسرا یہ شخص رسول اللہ ﷺ اور تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی سُنّتِ ثابتہ اور قائمہ کا انکار کر رہا ہے۔ اس لیے کہ سیرتِ رسولؐ اور صحابہؓ میں یہ بات ظاہر و باہر ہے کہ کلمہ پڑھتے ہی یعنی اصلاح یافتہ ہوتے ہی کفر کے ساتھ پنجہ آزمائی شروع ہو جاتی تھی۔ تو یہ موقف کہ فقہ میں اقامتِ دین کو فرضِ عین نہیں کہا گیا، فقہ کی غلط تعبیر ہے۔

اب آیئے تیسرے سبب کی طرف۔ اقامتِ دین کی جدوجہد کو ڈنکے کی چوٹ بیان کرنا اور اسے اُمتِ مسلمہ کا فرضِ اولین قرار دینے میں عالمگیریت کا دباؤ جس طرح مانع ہوتا ہے اس سے دو طرح کے لوگ متاثر ہوتے ہیں:

(۱) دین کے وہ داعی جنہوں نے اپنے اوپر فرض کر لیا ہے کہ انہیں یورپ میں ہی رہائش پذیر رہنا ہے۔

(۲) دین کے وہ داعی جن کی تبلیغی مساعی کا میدان عالمی سوشل میڈیا ہے اور ان کے سینوں میں یہ خواہش انگڑائیاں لیتی رہتی ہے کہ انہیں انٹرنیشنل فورمز پر خطاب کی دعوت دی جائے۔

دین کے وہ داعی جنہوں نے امریکہ یا برطانیہ کی نیشنلٹی حاصل کی ہوئی ہے اور وہاں رہنا انہوں نے اپنے اوپر فرض کر لیا ہے، ان کے لیے مشکل ہے کہ وہ دین کے غلبہ کی جدوجہد کی پکار لگائیں یا قتال فی سبیل اللہ کے وہ مقاصد بیان کریں جو ایک اسلامی مملکت کی خارجہ پالیسی کا حصہ ہے۔ ان کے لیے مشکل ہے کہ وہ ایک اسلامی مملکت میں غیر مسلموں کے مقام اور حیثیت کے تعین کی بات کریں۔ وہ اگر یہ بیان کریں گے کہ اسلام کفر کو برداشت نہیں کرتا تو ان کے لیے ان ممالک میں شہریت حاصل کر کے وہاں رہائش پذیر رہنا ناممکن ہو جائے گا۔

اگر وہ امارتِ اسلامیہ میں غیر مسلموں کے مقام اور حیثیت کو بیان کریں گے تو انہیں امریکہ اور برطانیہ کے معاشروں میں برابر کے حقوق کیسے مل سکتے ہیں؟ انہیں لازماً دوسرے درجے کے شہری کے طور پر وہاں زندگی گزارنا ہوگی۔ جب وہ خود نہیں بدلتے تو انہیں لازماً دینی تعلیمات کی اور اسلام کی پالیسیاں جو وہ عالمِ کفر کے متعلق رکھتا ہے ان کی تاویل اس طرح کرنا پڑتی ہے کہ انہیں اس کفر کے معاشرے میں کوئی مزاحمت پیش نہ آئے۔ یہ لوگ اس بات کو تو اُجاگر کریں گے کہ اسلام اہلِ کتاب کے ساتھ کھانے پینے سے منع نہیں کرتا بلکہ اہل کتاب عورتوں سے شادی کی بھی اجازت دیتا ہے، لیکن ''جہاد فی سبیل اللہ لاعلاءِ کلمۃ اللہ'' کو یہ لوگ کچھ سر پھروں کی مذہبی رومانویت قرار دیتے ہوئے کہیں گے کہ لڑنے بھڑنے کی صورت میں ہم ان کے ساتھ کیسے کھا پی سکتے ہیں، ان کی عورتوں سے شادیاں کیسے کر سکتے ہیں؟ ہمیں لازماً کفر کے وجود کو بقائے باہمی کا حق دینا ہوگا، اگر ہم ان کے نظام کو برداشت نہیں کریں گے تو وہ ہمارے نظام کو کیسے برداشت کریں گے!

یہی مسئلہ سوشل میڈیا مبلّغین کا ہے، اِلا ماشاء اللہ۔ خاص طور پر وہ داعیانِ دین جن کی خواہش ہوتی ہے کہ بیرونِ ملک سے انہیں دوروں کی دعوت ملے، بین الاقوامی فورمز پر ان کے خطاب ہوں، ان کے لیے اسلام کے انقلابی فکر کو بانگِ دہل بیان کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ جب ہم یورپی ممالک کا سفر کرتے ہیں تو ان کے ہوائی اڈوں پر سکروٹنی کا اتنا سخت بندوبست ہوتا ہے کہ وہ کسی ایسے فرد کو اپنے ملک میں داخل نہیں ہونے دیتے جو ان کے معاشروں میں ''تفرقہ''

کا سبب بنے یا ان کے مثالی نظامِ حیات پر تنقید کرے۔ سوشل میڈیا میں گھومنے والا ہر انسان ان کی نظروں میں ہوتا ہے' بلکہ ایسے افراد کی انہوں نے فائلیں بنائی ہوئی ہیں' ان کا سارا ریکارڈ ایک پل میں ان کے سامنے آجاتا ہے۔ ایسے افراد کا ان ملکوں میں داخلے کا خواب ادھورا رہ جاتا ہے۔ چنانچہ یہ ان کی ضرورت ہوتی ہے کہ ان کی داعیانہ لن ترانیوں میں اقامتِ دین کے غلبے کے موقف میں اتنی ڈھیل موجود ہو جو انہیں غیروں کی نظروں میں کھٹکنے نہ دے۔

﴿رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ ۝۸﴾

''اے ہمارے رب! ہمیں ہدایت دینے کے بعد ہمارے دل ٹیڑھے نہ کر دے اور ہمیں اپنے پاس سے رحمت عطا فرما' یقیناً تو ہی بہت بڑی عطا دینے والا ہے۔''

آج بانی تنظیم اسلامی کی اعلائے کلمۃ اللہ کی مساعی کو یہ کہہ کر گہنانے کی کوشش کی جارہی ہے کہ ہم ان کو نبی اور رسول نہیں مانتے۔ یقیناً یہ بات سو فیصد سے زیادہ درست ہے۔ اصل میں ایسے لوگوں کی نگاہوں میں ''مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ'' کی اقامتِ دین کی انقلابی جدوجہد کا کوئی مقام نہیں ہے۔ ایسے لوگوں نے فقہاء کرام کو رسولوں اور نبیوں کا درجہ دے کر فقہ کی روح تک اپنی عدم رسائی پر مہر ثبت کی ہے اور فقہاء کرام پر ایسا بہتان عظیم باندھا ہے جس کے وہ اپنی زندگی میں کبھی معترف نہ ہو سکتے تھے۔ اقامت دین کے بارے میں بانی محترم کا موقف جو انہوں نے ایک طالبِ حق کے مکتوب کے جواب میں لکھا' مِن وعَن تحریر کر کے بات ختم کی جارہی ہے۔ یہ مکتوب اور بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ کا تحریر کردہ جواب میثاق' شمارہ دسمبر ۲۰۰۴ء میں شائع ہوا تھا۔

ایک مسلمان سے دین کے تین اہم تقاضے

مُطالباتِ دین

• عبادتِ رب • فریضہ شہادت علی الناس • فریضہ اقامتِ دین

ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

صفحات:120 قیمت:90روپے

''اقامتِ دین کی جِدّوجُہد فرضِ عین ہے!''

چند اشکالات اور اُن کے جوابات

محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب!

السلام علیکم

عرصۂ دراز کے بعد آپ سے سلسلہ جنبانی کا ارادہ ہوا۔ گزشتہ ڈیڑھ دو سال کے دوران میں نے شاہ ولی اللہ' ابوالحسن علی ندوی' سید قطب شہید' علامہ مشرقی' علی عزت بیگووچ' ڈاکٹر برہان احمد فاروقی' جاوید احمد الغامدی' الطاف جاوید' ڈاکٹر افتخار آغا' کانٹ کا فلسفہ' گبن کی تاریخ' ابنِ خلدون کا مقدمہ اور امام غزالی کی احیاء العلوم کا مطالعہ کیا۔ پروفیسر محمد اجمل خاں کے نظریہ ''قرآن کی ترتیب نزولی'' کو سمجھنے کا موقع ملا۔ اس ساری تمہید کا مقصد یہ ہے کہ دورانِ مطالعہ مجھے آپ کے اس احسان کا شدت سے احساس ہوا کہ اگر آپ کی رفاقت میسّر نہ ہوتی تو ان دقیق کتابوں کو کبھی نہ سمجھ سکتا۔ قرآن حکیم کا ۲۵ سالہ مطالعہ مفکّرین کے فکری جھول کو بھی واضح کرنے میں ممد و معاون ثابت ہوا' جس پر راقم آپ کا شکر گزار ہے۔

آپ کی احسان مندیوں کا تقاضا ہے کہ آپ کی جو چیزیں سمجھ میں نہ آئیں وہ آپ سے پوچھوں اور اپنی رائے بھی دوں۔

ہمدرد ہال راولپنڈی میں آپ نے اپنی فکر کا صغریٰ کبریٰ درج ذیل انداز میں بیان کیا:

۱) اقامتِ دین کی جدوجہد فرضِ عین ہے۔

۲) اس جدوجہد کے لیے جماعت لازم ہے۔

۳) اس جماعت کا نظم ایسا ہونا چاہیے کہ اس کے امیر کے ہاتھ پر بیعت سمع و طاعت فی المعروف لازم ہو۔

مندرجہ بالا تنقیحات سے جو سوالات پیدا ہوتے ہیں ان کا جواب مطلوب ہے:

۱) فرضِ عین کسے کہتے ہیں؟

۲) جو مسلمان مندرجہ بالا لوازمات پورے نہیں کر رہے کیا وہ فرضِ عین کے تارک ہیں؟ بنابریں گناہ کبیرہ کے مرتکب ہیں؟

۳) آپ کے بیان کردہ لوازمات پر صرف اڑھائی تین ہزار رفقائے تنظیم ہی پورے اترتے ہیں۔ باقی سوا ارب مسلمان جو مسلسل فرضِ عین کو ترک کیے ہوئے ہیں' رفقائے تنظیم کو ان کے ساتھ کیا طرزِ عمل اختیار کرنا چاہیے' بالخصوص ایسے رشتہ دار' اقرباء اور واقف کار جن پر مندرجہ بالا فکر کو بھی واضح کر چکے ہوں؟

۴) وہ شخص جو پہلے اقامت دین کی جدوجہد کے فرضِ عین ہونے اور سمع وطاعت فی المعروف والی جماعت میں شامل ہونے کو فرضِ عین نہ سمجھتا ہو' آپ نے یا رفقائے تنظیم نے تبلیغ کے ذریعہ اس پر واضح کر دیا لیکن پھر بھی وہ اسے فرضِ عین ماننے سے انکاری ہے' کیا ایسے منکرِ فرضِ عین کو آپ دائرۂ اسلام سے خارج سمجھیں گے یا نہیں؟ دونوں شکلوں میں دلیل دیجیے!

۵) کیا رفقائے تنظیم کو ایسے ائمہ کے پیچھے نماز پڑھنی چاہیے جنہیں وہ فرضِ عین کا تارک سمجھ رہے ہوں اور ان پر واضح بھی نہ کر رہے ہوں کہ ہم آپ کے پیچھے اگر نماز پڑھ رہے ہیں تو بالاکراہ پڑھ رہے ہیں' کیونکہ آپ کسی ایسی جماعت میں نہیں ہیں جس کا نظم بیعت سمع وطاعت فی المعروف پر مبنی ہو؟ اگر وہ آپ کے مندرجہ بالا لوازمات کو جاننے کے بعد نہ مانے تو کیا پھر بھی اس کے پیچھے نماز پڑھنی چاہیے؟ جبکہ اس انکار پر وہ فرضِ عین کا تارک قرار پائے گا۔

امید ہے آپ جواب سے مطلع فرمائیں گے۔

والسلام

ایک طالبِ حق

جواب

محترمی ومکرمی ——— وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

مزاجِ گرامی

میرے ''فکر کا صُغریٰ کُبریٰ'' جو آپ نے تین نکات کی صورت میں بیان کیا ہے' ان میں

سے پہلے دو تو صدفی صد درست ہیں' البتہ تیسرے کے بارے میں مَیں بارہا وضاحت کر چکا ہوں کہ اقامتِ دین کی جدوجہد کے لیے جماعت سازی کے ضمن میں خود تو ''منصوص' مسنون اور ماثور'' بیعت سمع وطاعت فی المعروف کو ترجیح دیتا ہوں' البتہ کسی دستوری بیعت کو بھی مباح سمجھتا ہوں۔

رہے آپ کے سوالات تو ان کے ضمن میں بنیادی اور اہم ترین بات یہ ہے کہ میری ساری گفتگو ''اسلام'' کی سطح پر نہیں بلکہ ''ایمان'' کی سطح پر ہوتی ہے—— ایمان اور اسلام کے مابین فرق کو واضح کرنے کے لیے ہی حضرت جبریل علیہ السلام آنحضور ﷺ کی خدمت میں آئے تھے—— اور حدیث جبریلؑ کی ایک روایت کے مطابق آنحضور ﷺ نے فرمایا تھا کہ ((هٰذَا جِبْرِيْلُ اَرَادَ اَنْ تَعَلَّمُوْا اِذْ لَمْ تَسْأَلُوْا)) (مسلم) حالانکہ یہ واضح ہے کہ اس میں سوائے ''احسان'' کی تعریف کے کوئی بات نئی نہ تھی—— پہلی دونوں چیزیں صحابہ کرامؓ کے علم میں تھیں—— البتہ ان کا بیک وقت تقابل جس طرح سورۃ الحجرات کی آیات ۱۴' ۱۵ میں ہوا ہے' اسی طرح کا تقابل یہاں تلقین کیا گیا ہے—— بدقسمتی سے ہمارے قرونِ اولیٰ کے بعد وہ تین چیزیں جو ایک ہی سلسلے کی تین کڑیاں تھیں' تدریجاً مختلف دائروں میں منقسم اور جداگانہ حلقوں کی توجہ کا مرکز بن گئیں—— یعنی ''اسلام'' جس پر مسلمان معاشرے اور ریاست کی شہریت کی بنیاد ہے' علماء کرام اور مفتیانِ عظام کی توجہ کا مرکز بن گیا—— ''ایمان'' متکلمین کا میدان قرار پایا اور ''احسان'' صوفیاء کرام کا موضوع بن گیا!

اس تمہید کے بعد عرض ہے کہ اسلام کی اصل بنیاد کلمۂ شہادت یعنی اقرار باللسان پر ہے (اگرچہ فقہاء اس میں تصدیق کا اضافہ کرتے ہیں' لیکن اگر اس سے تصدیق باللسان مراد ہے تو وہ تو وہی بات ہوئی' لیکن اگر تصدیق قلبی مراد ہے تو ظاہر ہے کہ اس کی توثیق یا تردید کا ہمارے پاس کوئی ذریعہ نہیں ہے)۔ اس اسلام کے ارکان وہی پانچ ہیں جن کا ذکر نہ صرف حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی مشہور حدیث میں ہے بلکہ خود حدیثِ جبریلؑ میں بھی ہے—— اعمال کا درجہ اس ضمن میں ثانوی ہے۔ اور حضرت امام ابوحنیفہؒ کا یہ قول کہ کوئی مسلمان گناہ کبیرہ کے ارتکاب سے بھی دائرۂ اسلام سے خارج نہیں ہوتا' صدفی صد درست ہے—— البتہ میرے نزدیک ''ایمانِ حقیقی'' میں ان پانچ ارکانِ اسلام پر دو اضافی ''ارکان'' مستزاد ہو جاتے ہیں یعنی

''یقین'' دل میں اور ''جہاد فی سبیل اللہ'' عمل میں! (بفحوائے آیت ۱۵' سورۃ الحجرات)— اوراسی اعتبار سے میں اقامت دین کی جدوجہد کو ''فرضِ عین'' قرار دیتا ہوں' البتہ اس کے تارک کو ہرگز نہ دائرہ اسلام سے خارج سمجھتا ہوں نہ ہی ''گناہِ کبیرہ'' کا مرتکب خیال کرتا ہوں — ایسے سب لوگ یا تو غفلت اور غلط فہمی کا شکار ہیں' یا اگر میرے فکر سے بالکلیہ متفق ہونے کے باوجود عملاً اس سے کنارہ کش ہیں تو ضعف ایمان میں مبتلا ہیں یا ''ضعف ارادہ'' کے نفسیاتی مرض کا شکار ہیں— تاہم ایسے سب لوگ بھی دائرہ اسلام میں داخل ہیں اور ان میں سے ہرایک کے پیچھے نماز جائز ہے' بفحوائے فرمانِ نبوی علیٰ صاحبہ الصلوٰۃ والسلام: ((وَالصَّلَاةُ وَاجِبَةٌ عَلَيْكُمْ خَلْفَ كُلِّ مُسْلِمٍ بَرًّا كَانَ اَوْ فَاجِرًا وَاِنْ عَمِلَ الْكَبَائِرَ)) (ابوداوٗد)

رفقائے تنظیم کا اپنے اعزہ واقارب کے ساتھ سلوک اس حدیث نبویؐ کی رو سے ہوگا کہ ((لِلْمُسْلِمِ عَلَى الْمُسْلِمِ سِتَّةٌ)) اس لیے کہ جیسے کہ عرض کر چکا ہوں کہ یہ سب دائرۂ اسلام میں داخل وشامل ہیں' اِلاّ یہ کہ ان میں سے کوئی دین کی بنیادی باتوں میں سے کسی کا انکار کرے یا اس سے کوئی ایسا عمل ظاہر و باہر طور پر سرزد ہو جو ''کفر بواح'' یا ''شرکِ جلی'' کا آئینہ دار ہو' مثلاً کسی بُت کو سجدہ کر لینا وغیرہ وغیرہ۔

یہ بھی واضح رہنا چاہیے کہ کسی مدعیٔ اسلام کو کافر یا غیر مسلم یا دائرہ اسلام سے خارج قرار دینا یا تو اسلامی حکومت کا کام ہے یا اس کی عدم موجودگی میں مفتیانِ کرام اور فقہائے عظام کا کام ہے' اور وہ بھی ''قضا'' کے جملے تقاضے پورے کرنے کے بعد!— یہ کام انفرادی طور پر بڑے سے بڑا شخص بھی نہیں کر سکتا۔

امید ہے کہ میری ان وضاحتوں سے آپ کی اور آپ کے رفقاء کی بھی تسلّی ہو جائے گی— اور ایسے دوسرے حضرات کو بھی اطمینان ہو جائے گا جو بعض اوقات میری خطیبانہ شدت کی بنا پر مغالطوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں — فقط والسّلام

خاکسار

اسرار احمد عفی عنہ

سلسلہ وار دروسِ قرآن (۱۱)

ایمان اور اس کے ثمرات و مضمرات

شجاع الدّین شیخ ☆

آج کے درس کا عنوان ہے: ''ایمان اور اس کے ثمرات و مضمرات'' اور اس ضمن میں ہم سورۃ التغابن کے دوسرے رکوع کا مطالعہ کریں گے۔ سب سے پہلے اس رکوع کی آیات کا اجمالی تجزیہ کرتے ہیں۔ آیات ۱۱ تا ۱۳ میں فرد کی ذاتی زندگی پر ایمان کے اثرات کا بیان ہے' یعنی دل میں اگر ایمان موجود ہو تو انفرادی سطح پر ایمان کے کیا اثرات ایک فرد پر ہوتے ہیں۔ آیات ۱۴' ۱۵ میں دنیوی تعلقات کے بارے میں فرد کے نقطۂ نظر پر ایمان کے اثرات کا بیان ہے۔ آیات ۱۶' ۱۷ میں ایمان کے تقاضے ادا کرنے کی دعوت ہے اور آخری آیت ۱۸ میں توحید باری تعالیٰ کا بیان ہے۔ سورہ کے آغاز میں اللہ کی تسبیح کا بیان ہوا تھا اور اب آخر میں اس کی ذات و صفات کا بیان ہمارے سامنے آئے گا۔

ربّ کی رضا پہ راضی رہنا

اللہ تعالیٰ کی طرف سے وارد شدہ حالات میں بندۂ مؤمن کا رویّہ کیا ہونا چاہیے' آیت ۱۱ میں اس کا بیان ہے۔ ارشاد ہوا:

﴿مَا اَصَابَ مِنْ مُّصِیْبَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَمَنْ یُّؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ یَهْدِ قَلْبَهٗ ؕ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ﴿۱۱﴾﴾

''کوئی مصیبت نازل نہیں ہوتی مگر اللہ تعالیٰ کے حکم سے' اور جو شخص اللہ پر ایمان رکھتا ہے وہ اُس کے دل کو ہدایت دیتا ہے' اور اللہ ہر چیز سے باخبر ہے۔''

دنیا میں وارد ہونے والی ہر صورتِ حال اللہ ہی کے حکم سے پیش آتی ہے' اگرچہ ظاہر میں کچھ

☆ معاون برائے مرکزی شعبہ تعلیم و تربیت' تنظیم اسلامی

اسباب اس کی وجہ دکھائی دیتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ دنیا اسباب کے تحت چلتی ہے مگر حکم مسبّب الاسباب اللہ ربّ العزت کا ہوتا ہے۔ موت اللہ کے حکم سے آتی ہے' لیکن سبب کوئی بھی ہو سکتا ہے' مثلاً کوئی حادثہ پیش آ گیا یا کوئی مہلک بیماری موت کا سبب بن گئی۔ زلزلہ بھی اللہ ربّ العزت کے حکم سے آتا ہے' البتہ اس کے اسباب مختلف ہو سکتے ہیں۔ کوئی سونامی اس کا سبب بن جاتا ہے یا کچھ اور سبب بن جاتا ہے۔

اس ضمن میں یہ نوٹ کر لیں کہ اللہ تعالیٰ کا اذن یا حکم اور شے ہے جبکہ اس کی رضا اور شے ہے۔ اچھے کام میں اس کے اذن کے ساتھ ساتھ اس کی رضا بھی شامل ہوتی ہے' اس کے برعکس برے کام میں اس کا اذن شامل ہوتا ہے' لیکن رضا نہیں۔ بندہ اللہ کے حکم سے زبان کو حرکت دے کر سچ بولتا ہے' تو اذن اللہ کا ہو گا اور وہ اس پر راضی بھی ہو گا کہ بندے نے سچ بولا۔ اس کے برعکس بندہ اللہ کی دی ہوئی زبان سے جھوٹ بولتا ہے تو اختیار بندے کا ہے' اور یہاں بھی اذن اللہ کی طرف سے ہے' لیکن اللہ ربّ العزت بندے کے جھوٹ پر اس سے راضی نہیں ہوتا۔

مؤمنانہ طرزِ عمل اللہ تعالیٰ کے فیصلے پر بندے کا راضی رہنا ہے۔ بیان شدہ حقائق بندۂ مؤمن میں تسلیم و رضا کی کیفیت پیدا کرتے ہیں۔ اس کے برعکس ایک عام انسان کی نگاہ صرف اسباب پر ہوتی ہے اور وہ اچھے اور بُرے حالات کا بہت زیادہ اثر لیتا ہے۔ اگر وہ حقائق سامنے نہ ہوں جن کا ادراک ایک بندۂ مؤمن کو ہوتا ہے تو بدلتے حالات میں لوگ اور زیادہ مشکلات اور پریشانیوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اس بارے میں سورۂ بنی اسرائیل میں ارشاد ہوا: ﴿وَاِذَاۤ اَنْعَمْنَا عَلَی الْاِنْسَانِ اَعْرَضَ وَنَاٰ بِجَانِبِهٖ ۚ وَاِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ كَانَ یَـُٔوْسًا ﴿۸۳﴾﴾ ''اور جب ہم انسان کو نعمت بخشتے ہیں تو اعراض کرتا ہے اور پہلو پھیر لیتا ہے' اور جب اسے سختی پہنچتی ہے تو وہ نا اُمید ہو جاتا ہے۔''

یَهْدِ قَلْبَهٗ (دل کو ہدایت دینے) سے مراد ہے کہ حادثات کے بارے میں بندۂ مؤمن کو ان حقائق کی رہنمائی نصیب ہوتی ہے کہ جو کچھ ہوا اللہ کے حکم سے ہوا' یہ پہلے سے طے شدہ تھا اور جو کچھ ہوا اسی میں خیر ہے۔ اس دنیا کی ہر راحت اور تکلیف عارضی ہے اور جو کچھ ہوا اس میں آزمائش ہے' البتہ آخرت میں جواب دہی کے حوالے سے وہ آزمائش نسبتاً آسان ہے جس میں کچھ لے لیا گیا ہو۔ پھر یہ کہ اللہ کی جتنی زیادہ نعمتوں کو استعمال کیا جائے گا' اتنا ہی ان نعمتوں

کے بارے میں جواب دہی ہوگی۔ سورۃ التکاثر میں فرمایا گیا: ﴿ثُمَّ لَتُسْئَلُنَّ یَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِیْمِ ۝۸﴾ ''پھر لازماً تم سے نعمتوں کے بارے میں سوال کیا جائے گا۔''

وَاللّٰہُ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ (اللہ تعالیٰ کا ہر شے کا علم رکھنے) کا تعلق مسئلہ تقدیر سے ہے' جس کے دو اجزاء ہیں۔ کائنات کا ہر کام اللہ کے اذن ہی سے ہوتا ہے اور کائنات میں ہونے والے ہر کام کا علم اللہ کو پہلے سے ہی ہے۔ جب بندے کو تقدیر پر یقین ہوگا تو بدلتے حالات میں یہی طرزِ عمل سامنے آئے گا کہ جو کچھ ہو رہا ہے اللہ کے اذن سے ہو رہا ہے اور اسی میں خیر ہوگی' لہٰذا اللہ کے فیصلے پر راضی رہنا چاہیے۔

اللہ عزّوجل اور رسول ﷺ کی اطاعت لازم ہے!

آیت ۱۲ میں بندۂ مؤمن کے ہاتھ سے صادر ہونے والے اعمال کا نقشہ نظر آتا ہے۔ ارشاد ہوا: ﴿وَاَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّیْتُمْ فَاِنَّمَا عَلٰی رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِیْنُ ۝۱۲﴾ ''اور اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول (ﷺ) کی' پھر اگر تم منہ پھیر لو گے تو ہمارے رسول کے ذمے تو پیغام کھول کھول کر پہنچا دینا ہی ہے''۔ بندۂ مؤمن کا ہر ارادی فعل اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کے سانچے میں ڈھلا ہوتا ہے۔ ایک حدیث مبارکہ میں آتا ہے کہ مؤمن وہ ہے جسے دیکھ کر اللہ یاد آ جائے۔ اس کے شب و روز بتائیں گے کہ وہ اللہ کو بھی مانتا ہے اور اُس کی بھی مانتا ہے۔ اس حدیث مبارکہ کی تشریح میں' میں یہ عرض کیا کرتا ہوں کہ اُمتی وہ ہوگا جس کو دیکھ کر رسول اللہ ﷺ یاد آئیں۔

لفظ اطاعت کے معنی ہیں: کسی کی بات کو غور سے سننا' اس کو اہمیت دینا یا اس کو مان کر عمل کرنا۔ یہ ایک جامع لفظ ہے جو اللہ اور رسول ﷺ کے تمام احکامات یعنی اوامر و نواہی پر عمل کو ظاہر کرتا ہے۔ قرآن حکیم میں گیارہ (۱۱) بار اللہ کے ساتھ اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کا حکم آیا ہے اور سورۃ النساء میں تو یہاں تک فرما دیا گیا: ﴿مَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰہَ ۚ﴾ (آیت ۸۰) ''جس نے رسول کی اطاعت کی اسی نے اللہ کی اطاعت کی''۔ مثلاً نماز اللہ کے لیے ادا کی جاتی ہے مگر طریقہ رسول اللہ ﷺ سے لیا جاتا ہے۔ جب آپ ﷺ کے طریقے کے مطابق قیام اور رکوع و سجود کریں گے۔ اللہ کے حکم ـــــ نماز قائم کرو ـــــ پر عمل ہوگا۔ رسول اللہ ﷺ کی اطاعت عملاً پہلے آ رہی ہے۔ گویا اطاعت اصلاً اللہ کی ہوتی ہے' لیکن عملاً رسول کی

ہوتی ہے' کیونکہ وہی اللہ کے نمائندے اور انسانوں کے لیے کامل نمونہ ہوتے ہیں۔ اسی بات کو رسول اللہ ﷺ نے یوں ارشاد فرمایا: ((مَنْ اَطَاعَنِیْ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰہَ ، وَمَنْ عَصَانِیْ فَقَدْ عَصَی اللّٰہَ، وَمَنْ اَطَاعَ اَمِیْرِیْ فَقَدْ اَطَاعَنِیْ، وَمَنْ عَصٰی اَمِیْرِیْ فَقَدْ عَصَانِیْ)) (متفق علیہ) ''جس نے میری اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی' اور جس نے میری نافرمانی کی اس نے اللہ کی نافرمانی کی' اور جس نے میرے (مقرر کردہ) امیر کی اطاعت کی اُس نے میری اطاعت کی' اور جس نے میرے (مقرر کردہ) امیر کی نافرمانی کی اس نے میری نافرمانی کی۔''

اطاعت کے حوالے سے دو تین باتیں اہم ہیں جو میں نے آپ کے سامنے رکھنی ہیں۔ پہلی بات یہ کہ اطاعتِ رسول (ﷺ) سے گریز منافقت کی نشانی ہے۔ تین امور منافقوں پر بہت گراں تھے: ہجرت' قتال فی سبیل اللہ اور نبی اکرم ﷺ کی شخصی اطاعت۔ سورۃ النساء میں بار بار منافقین کا پردہ چاک کیا گیا ہے اور بار بار اطاعتِ رسول (ﷺ) پر زور دیا گیا ہے۔ آیت ۶۵ میں ارشاد ہوا: ﴿فَلَا وَرَبِّکَ لَا یُؤْمِنُوْنَ حَتّٰی یُحَکِّمُوْکَ فِیْمَا شَجَرَ بَیْنَھُمْ ثُمَّ لَا یَجِدُوْا فِیْٓ اَنْفُسِھِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَیْتَ وَیُسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا ۝۶۵﴾ ''پس نہیں' قسم ہے آپ (ﷺ) کے رب کی' یہ لوگ مؤمن نہیں ہیں جب تک کہ اپنے تنازعات میں آپ (ﷺ) کو منصف نہ بنائیں اور جو فیصلہ آپ (ﷺ) کر دیں اُس سے اپنے دل میں تنگ نہ ہوں' بلکہ اسے خوشی سے مان لیں''۔ دوسری بات یہ کہ موجودہ دور میں اطاعتِ رسولؐ سے فرار کا نتیجہ ''انکارِ سنّت'' کے فتنے کی صورت میں ظاہر ہوا ہے۔ منکرینِ سنّت قرآن کی طرف آنے کو تو تیار ہیں' لیکن سنت پر عمل سے گریز کرتے ہیں اور وہ سنت کو دین میں اتھارٹی تسلیم نہیں کرتے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس فتنے سے محفوظ رکھے اور ہمیں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی کامل اطاعت کی توفیق عطا فرمائے۔

اسی حوالے نبی اکرم ﷺ نے صدیوں پہلے ہمیں متنبہ فرمایا تھا کہ کچھ لوگ کھڑے ہوں گے اور سنت کا انکار کریں گے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ((أَلَا إِنِّی أُوتِیتُ الْکِتَابَ وَمِثْلَهُ مَعَهُ، أَلَا یُوشِكُ رَجُلٌ شَبْعَانُ عَلَی أَرِیكَتِهِ: یَقُولُ: عَلَیْكُمْ بِهٰذَا الْقُرْآنِ، فَمَا وَجَدْتُمْ فِیهِ مِنْ حَلَالٍ فَأَحِلُّوهُ وَمَا وَجَدْتُمْ فِیهِ مِنْ حَرَامٍ فَحَرِّمُوهُ)) (سنن ابی داؤد) ''سن لو' مجھے قرآن دیا گیا ہے اور اسی کی مانند ایک اور شے۔ اس بات کا اندیشہ ہے

کہ ایک شکم سیر شخص اپنی آرام دہ مسند پر بیٹھ کر کہے کہ تم پر صرف قرآن کے حکم کی پابندی لازم ہے‘ پس جس شے کو اس میں حلال پاؤ اسے حلال سمجھو اور جس شے کو اس میں حرام پاؤ اسے حرام سمجھو۔‘‘

زیرِ مطالعہ آیت کے آخر میں فرمایا کہ ہمارے رسول کے ذمہ بس واضح طور پر پہنچانا ہے‘ یعنی رسول اللہ ﷺ کی ذمہ داری صرف اور صرف واضح طور پر حق کو پہنچا دینا ہے۔ سورۃ الغاشیہ میں ارشاد ہوا: ﴿فَذَكِّرْ ۗ اِنَّمَآ اَنْتَ مُذَكِّرٌ ﴿۲۱﴾ لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ ﴿۲۲﴾﴾ ’’پس (اے نبی ﷺ!) یاد دہانی فرمایئے‘ آپ تو بس نصیحت فرمانے والے ہیں۔ آپ ان پر داروغہ نہیں ہیں‘‘۔ یعنی آپ زبردستی ان سے حق قبول نہیں کروا سکتے۔ لہٰذا ایک داعی کو بھی یہ سمجھنا چاہیے کہ اُس کا کام صرف دعوتِ حق کو پہنچانا ہے‘ منوانا نہیں۔

اسباب کی فراہمی اور مسبّب الاسباب پر بھروسہ

آیت ۱۳ میں بندۂ مؤمن کا اسباب کے بارے میں کیا طرزِ فکر ہونا چاہیے‘ اس کا بیان ہے۔ ارشاد ہوا: ﴿اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۭ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۳﴾﴾ ’’اللہ (معبود برحق ہے‘ اس) کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں‘ اور مؤمنوں کو چاہیے کہ وہ اللہ ہی پر بھروسہ کریں‘‘۔ اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ کلمۂ توحید ہے‘ جس کے معنی ہیں اپنے معاملات اللہ کے حوالے کر کے اسی کو وکیل بنا لینا یعنی اُسی پر توکّل و اعتماد کرنا۔ گویا سب کچھ ہونے کا یقین اللہ کی ذات سے ہونا چاہیے‘ کیونکہ وہی کل نفع و نقصان کا اختیار رکھنے والا ہے۔ بندۂ مؤمن کی تمام امیدیں اور توقعات اللہ ہی سے وابستہ ہوتی ہیں‘ کیونکہ وہ یقین رکھتا ہے کہ کائنات میں فاعلِ حقیقی اللہ ہے۔ بندہ کسی کام کا ارادہ کرتا ہے‘ لیکن وہ ہو نہیں سکتا جب تک کہ اللہ کا اذن نہ ہو۔ کائنات میں مؤثّرِ حقیقی اللہ ربّ العزت کی ذات ہے۔ اشیاء میں تاثیر اُسی نے رکھی ہے اور وہ جب چاہے اس تاثیر کو ختم بھی کر سکتا ہے۔ اسباب اللہ کے پابند ہیں‘ لیکن اللہ اسباب کا پابند نہیں ہے۔ وہ اسباب کے بغیر بھی جو چاہے کر سکتا ہے۔

توکّل کے ذریعے انسان ایک مضبوط سہارے کو تھام لیتا ہے۔ سورۃ الطلاق میں ارشاد ہوا: ﴿وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ ۭ﴾ (آیت ۳) ’’اور جو اللہ پر بھروسہ رکھے گا تو اللہ اس کے لیے کافی ہے‘‘۔ اللہ ہمیں اس کا یقین عطا فرمائے۔ توکّل کے معنی ہیں اسباب فراہم کیے جائیں لیکن بھروسہ اسباب پر نہیں‘ بلکہ مسبّب الاسباب پر کیا جائے۔ دنیا کے معاملات

اسباب کے تحت چلتے ہیں۔ جائز حاجات کے لیے جائز اسباب کو استعمال کریں‘ مگر اللہ پر یہ اعتماد رکھیں کہ تاثیر وہی پیدا کرے گا۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک صحابیؓ نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا کہ میں اونٹنی کو باندھ کر توکل کروں یا بغیر باندھے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ((اِعْقِلْهَا وَ تَوَكَّلْ)) (سنن الترمذی) ’’اونٹنی (کا گھٹنا) باندھو‘ پھر توکّل کرو‘‘۔ یعنی اشیاء کی حفاظت کا پورا انتظام کیا جائے اور پھر اللہ پر توکل کیا جائے۔

مال‘ اولاد اور بیوی کی محبت میں مطلوب طرزِ عمل

بندۂ مومن کا بیوی اور اولاد کے ساتھ کیا رویہ ہونا چاہیے‘ اس کا بیان آیت ۱۴ میں آ رہا ہے۔ ارشاد ہوا:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ مِنْ اَزْوَاجِكُمْ وَاَوْلَادِكُمْ عَدُوًّا لَّكُمْ فَاحْذَرُوْهُمْ ۚ وَاِنْ تَعْفُوْا وَتَصْفَحُوْا وَتَغْفِرُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۴﴾﴾

’’اے وہ لوگو جو ایمان لائے! بلاشبہ تمہاری بیویوں اور اولاد میں سے بعض تمہارے دشمن ہیں‘ سو اُن سے ہوشیار رہو‘ اور اگر تم معاف کرتے رہو اور چشم پوشی کرتے رہو اور درگزر کرتے رہو تو بیشک اللہ بھی درگزر کرنے والا اور مہربان ہے۔‘‘

تمام رشتوں میں سب سے زیادہ محبت انسان کو بیویوں اور اولاد سے ہوتی ہے۔ سورۂ آل عمران کی آیت ۱۴ میں بہت ساری محبوب چیزوں کا ذکر ہے اور وہاں بھی عورتوں اور اولاد کا ذکر پہلے آیا ہے۔ یہ فطری محبت ہے جو ہمارے اندر رکھ دی گئی۔ بیویوں اور اولاد کی جائز ضروریات و خواہشات پوری کرنا فرض ہے‘ لیکن ضرورت اس بات کی ہے کہ انسان ہر دم چوکنا رہے کہ ان کی ضروریات پوری کرتے کرتے کہیں کوئی خلافِ شرع کام نہ کر بیٹھے۔ ایسا نہ ہو کہ دوسروں کی دنیا سنوارنے کے لیے اپنی آخرت خراب ہو جائے۔ یہ تمام رشتے صرف دنیا کی حد تک ہیں‘ روزِ قیامت اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرنے والے رشتے دار اور احباب ایک دوسرے کے دشمن ہوں گے۔ سورۂ عبس میں ارشاد ہوا: ﴿يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِيْهِ ﴿۳۴﴾ وَاُمِّهٖ وَاَبِيْهِ ﴿۳۵﴾ وَصَاحِبَتِهٖ وَبَنِيْهِ ﴿۳۶﴾ لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ يَوْمَئِذٍ شَاْنٌ يُّغْنِيْهِ ﴿۳۷﴾﴾ ’’اُس دن انسان اپنے بھائی سے دور بھاگے گا اور اپنی ماں اور اپنے باپ سے اور اپنی بیوی اور بیٹے سے۔ ہر شخص اس روز ایک ایسی فکر میں ہوگا جو اسے دوسروں سے غافل کر دے گی‘‘۔ فکر اس دن صرف یہ ہوگی کہ کسی طرح اس کو بچا لیا

جائے۔ اللہ اس برے انجام سے ہماری حفاظت فرمائے۔

اس ضمن میں یہ نکتہ بھی یاد رکھیں کہ مِنْ اَزْوَاجِكُمْ وَاَوْلَادِكُمْ میں لفظ مِنْ ظاہر کرتا ہے کہ تمام بیویاں اور اولاد دشمن نہیں ہیں۔ صالح بیوی کو حدیث میں 'خَيْرُ الْمَتَاعِ' یعنی بہترین متاع اور صالح اولاد کو 'صدقۂ جاریہ' کہا گیا ہے۔ چوکنا رہنے کے لیے اس لیے کہا گیا کہ ان کی محبت میں ڈوب کر اللہ کے احکام کی خلاف ورزی نہ کر بیٹھو۔ توازن کے لیے تین مترادف الفاظ (تَعْفُوْا، تَصْفَحُوْا، تَغْفِرُوْا) استعمال کیے گئے ہیں۔ یہ بڑا توازن اللہ رب العزت کے کلام میں ہے۔ اگر ایک انتہا درجے کا سخت لفظ (عَدُوٌّ) آیا تو اس کو متوازن کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے تین ہم معنی الفاظ استعمال فرمائے۔ چنانچہ اہل خانہ کی تربیت ایک تھانے دار کی حیثیت سے نہیں' بلکہ ہمدرد کی حیثیت سے' نرمی اور سختی کے متوازن امتزاج کے ساتھ کرنی ہوگی۔ دونوں باتیں ضروری ہیں' یہی وجہ ہے کہ قرآن بار بار جنت کا ذکر بھی کرتا ہے اور جہنم کے عذاب سے بھی ڈراتا ہے۔

آیت ۱۵ میں بندۂ مؤمن کے مال اور اولاد کے بارے میں نقطۂ نظر کا بیان ہے۔ ارشاد ہوا: ﴿اِنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ ۭ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗٓ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۵﴾﴾ ''بیشک تمہارا مال اور تمہاری اولاد تو آزمائش کا ذریعہ ہیں' اور اللہ ہی کے ہاں شاندار بدلہ ہے''۔ اس لیے مال اور اولاد سرمایہ نہیں' بلکہ ایسی امانتیں ہیں جن کے بارے میں باز پرس ہوگی۔ مال و دولت اور اولاد کو نہ بڑھاپے کا سہارا سمجھنا چاہیے اور نہ ان سے امید لگانی چاہیے۔ ان کے بارے میں سورۃ الکہف میں ارشاد ہوا: ﴿اَلْمَالُ وَالْبَنُوْنَ زِيْنَةُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَالْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَّخَيْرٌ اَمَلًا ﴿۴۶﴾﴾ ''مال اور بیٹے تو دنیا کی زندگی کی (رونق و) زینت ہیں' اور باقی رہنے والی نیکیاں بہتر ہیں تمہارے رب کے نزدیک ثواب کے اعتبار سے اور امید لگانے کے اعتبار سے۔''

تقویٰ' سمع وطاعت اور اِنفاق فی سبیل اللہ

آیت ۱۶ میں ایمان کے تقاضے ادا کرنے کی دعوت ہے اور اس آیت میں بڑی قیمتی اصطلاحات آئی ہیں۔ ارشاد ہوا:

﴿فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ وَاسْمَعُوْا وَاَطِيْعُوْا وَاَنْفِقُوْا خَيْرًا لِّاَنْفُسِكُمْ ۭ

وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۱۶﴾﴾

''سو جہاں تک ہو سکے اللہ کی نافرمانی سے بچو اور (اس کے احکامات) سنو اور مانو اور اس کی راہ میں خرچ کرو' (یہ) تمہارے حق میں بہتر ہے۔ اور جو شخص جی کے لالچ سے بچا لیا گیا تو ایسے ہی لوگ کامیاب ہونے والے ہیں۔''

تقویٰ: زیر مطالعہ آیت میں آنے والی پہلی اصطلاح 'تقویٰ' ہے۔ یہ قرآن کی بہت بنیادی اصطلاح ہے۔ تقویٰ کے لغوی معنی بچنے کے ہیں۔ اس کی بڑی پیاری تعبیر ایک صحابی نے کی ہے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے حضرت اُبی ابن کعب رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ تقویٰ کیا ہے؟ تو انہوں نے دریافت کیا کہ کیا آپ کبھی ایسے کسی راستے سے گزرے ہیں جو کانٹے دار جھاڑیوں کے درمیان ہو؟ حضرت عمر فاروقؓ نے جواب دیا: جی ہاں۔ حضرت اُبی ابن کعبؓ نے سوال کیا کہ اُس وقت آپ کیا کرتے ہیں؟ حضرت عمر فاروقؓ نے فرمایا کہ میں اپنا لباس سمیٹتا ہوں اور جسم کو محفوظ رکھنے کی کوشش کرتا ہوں۔ حضرت اُبی ابن کعبؓ نے فرمایا کہ یہی تقویٰ ہے۔ (تفسیر ابن کثیر)۔ تقویٰ ایک باطنی کیفیت کا نام ہے جس کی وجہ سے انسان پر ہر وقت خدا خوفی اور اُخروی جواب دہی کا احساس طاری رہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ یہ احساس ہمیں بھی عطا فرمائے۔

اللہ تعالیٰ ہر وقت دیکھ رہا ہے اور کل مجھے مرنے کے بعد اللہ کو جواب دینا ہے' یہ بات اگر دل میں بیٹھے گی دل کی گہرائیوں سے تبدیلی تبھی آسکتی ہے۔ قرآن حکیم میں جہاں بھی احکامِ شریعت بیان کیے گئے ہیں وہاں تقویٰ پر خصوصی زور دیا گیا ہے' اس لیے کہ جن کے دل میں اللہ کو جواب دہی کا احساس نہ ہو وہ شریعت کا بھی مذاق اڑاتے ہیں۔ سپریم کورٹ کا جج بھی کہہ دیتا ہے کہ جس نے سود لینا ہے لے لے' جسے نہیں لینا نہ لے' اللہ تعالیٰ پوچھ لے گا۔ اس طرح تو کوئی بھی جرم کرنا ہو کر لیا جائے' اللہ پوچھ لے گا۔

خاندانی زندگی میں تقویٰ کی اہمیت کے پیش نظر خطبۂ نکاح میں شامل تمام آیات میں تقویٰ کا ذکر آیا ہے۔ مثلاً سورۂ آلِ عمران کی آیت ۱۰۲ میں ارشاد ہوا: ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۱۰۲﴾﴾ ''مؤمنو! اللہ کی نافرمانی سے ایسے بچو جیسے کہ اس کی نافرمانی سے بچنے کا حق ہے اور تم ہرگز نہ مرنا مگر حالت فرمانبرداری میں''۔ اللہ تعالیٰ ہمیں بھی ایسی ہی موت عطا فرمائے۔

سمع وطاعت: اگلی اصطلاح 'سمع وطاعت' کی آئی ہے۔ یہ ایک اہم دینی اصطلاح ہے جس کا بیان قرآن حکیم میں کئی مرتبہ آیا ہے۔ مثلاً سورۃ البقرہ میں ارشاد ہوا: ﴿وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَاقف غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ﴿۲۸۵﴾﴾ ''وہ (اللہ سے) عرض کرتے ہیں کہ ہم نے (تیرا حکم) سنا اور قبول کیا۔ اے ہمارے رب! ہم تیری بخشش مانگتے ہیں اور تیری ہی طرف لوٹ کر جانا ہے''۔ اجتماعی اداروں میں سمع وطاعت اختیار کرنے کا حکم ہے بشرطیکہ شریعت کی خلاف ورزی نہ ہو۔ اقامتِ دین کے فریضے کی ادائیگی بغیر اجتماعیت کے ممکن نہیں اور اس اجتماعیت کے لیے منصوص، مسنون اور ماثور اساس سمع و طاعت ہی ہے۔ دین کے غلبے کی جدّوجُہد ہم پر لازم ہے اور اس کے لیے جماعت ہونی چاہیے اور وہ جماعت بیعت کی بنیاد پر ہو کہ امیر کی بات سنی جائے اور مانی جائے۔ یہ بیعت کی سنت قرآن میں بھی ہے، سنت میں بھی ہے اور صحابہ کرامؓ کے طرزِ عمل میں بھی ہے۔ مسند احمد اور جامع ترمذی کی روایت کے مطابق رسول اللہ ﷺ نے حکم بھی فرمایا: ((اَنَا آمُرُكُمْ بِخَمْسٍ، اَللّٰهُ اَمَرَنِي بِهِنَّ: بِالْجَمَاعَةِ، وَالسَّمْعِ، وَالطَّاعَةِ، وَالْهِجْرَةِ، وَالْجِهَادِ فِي سَبِيْلِ اللّٰهِ)) (سنن الترمذی و مسند احمد) ''میں تمہیں پانچ باتوں کا حکم دیتا ہوں، جن کا اللہ نے مجھے حکم دیا ہے: جماعت اختیار کرو، سنو اور اطاعت کرو، ہجرت کرو اور اللہ کی راہ میں جہاد کرو''۔ یہ سننا اور اطاعت کرنا جماعتی سطح پر بھی ہوگا اور جب ان شاء اللہ خلافت کا نظام قائم ہوگا تو جو مسلمانوں کا خلیفہ ہوگا اس کے ہاتھ پر بھی سمع وطاعت کی بیعت ہوگی۔

اِنفاق فی سبیل اللہ: اس آیت میں ایک اہم اصطلاح 'اِنفاق' آئی ہے۔ اِنفاق کا مطلب ہے: کسی شے کو خرچ کر دینا یا کھپا دینا۔ انفاق فی سبیل اللہ کا معنی ہے کہ اللہ کی دی ہوئی ہدایات کے مطابق کسی کارِ خیر پر خرچ کرنا۔ اس کا وسیع تر مفہوم یہ ہے کہ ہر اس شے کو خرچ کرنا جس پر انسان کو اختیار حاصل ہو۔ چنانچہ سورۃ الحدید میں فرمایا گیا: ﴿وَاَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَكُمْ مُّسْتَخْلَفِيْنَ فِيْهِ ط﴾ (آیت ۷) ''اور خرچ کرو ہر اُس شے میں سے جس میں تمہیں خلافت یعنی عارضی اختیار دیا گیا ہے''۔ اِنفاقِ مال کا فائدہ اجرِ آخرت کی صورت میں انسان ہی کو ملے گا کیونکہ یہ مال اللہ کے ہاں محفوظ ہو گیا۔

شُح سے بچنا: مزید ایک اصطلاح 'شُح' اس آیت میں آئی ہے۔ یہ لفظ تنگ نظری، تنگ دلی اور

کم حوصلگی کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ عام طور پر اسے بخل کا ہم معنی لفظ سمجھ لیا جاتا ہے لیکن یہ بخل سے وسیع تر بلکہ بخل، حرص، حسد اور کینہ جیسی کئی بیماریوں کی جڑ ہے۔ صحیح مسلم کی روایت کے مطابق رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((وَاتَّقُوا الشُّحَّ، فَإِنَّ الشُّحَّ أَهْلَكَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ، حَمَلَهُمْ عَلَى أَنْ سَفَكُوا دِمَائَهُمْ وَاسْتَحَلُّوا مَحَارِمَهُمْ)) (صحیح مسلم) ''شح سے بچو، کیونکہ شح ہی نے تم سے پہلے لوگوں کو ہلاک کیا۔ اسی نے ان کو ایک دوسرے کا خون بہانے اور دوسروں کی حرمتوں کو اپنے لیے حلال کر لینے پر اکسایا''۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس سے حفاظت میں رکھے۔ دیکھئے، یہاں یہ نہیں فرمایا کہ جو شح سے ''بچ گیا'' بلکہ فرمایا کہ ''جو بچا لیا گیا''، وہی لوگ کامیاب ہوں گے۔ گویا اللہ کی توفیق کے بغیر باطن کی ان برائیوں سے بچنا ممکن نہیں۔

قرضِ حسنہ اور صدقات کی فضیلت

آیت ۱۷ میں ارشاد فرمایا گیا: ﴿اِنْ تُقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا يُّضٰعِفْهُ لَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ط وَاللّٰهُ شَكُوْرٌ حَلِيْمٌ﴿۱۷﴾﴾ ''اگر تم اللہ کو بہترین قرض دو گے تو وہ تم کو اس کا کئی گنا دے گا اور تمہارے گناہ بھی معاف کر دے گا، اور اللہ بہت قدر دان اور بردبار ہے''۔ انفاق فی سبیل اللہ کے لیے دو مدات ہیں: (۱) 'صدقہ' بندوں کی احتیاج پوری کرنے کے لیے جو مال خرچ کیا جاتا ہے، اور (۲) 'قرضِ حسنہ' اللہ کے دین کی تبلیغ اور غلبے کے لیے خرچ کیے جانے والے مال کو کہتے ہیں۔ صدقہ فرض کی صورت میں زکوٰۃ، صدقۂ فطر کی صورت میں واجب اور دیگر صدقات کی صورت میں نفل کا درجہ رکھتا ہے اور انہیں عام طور پر بندوں کی حاجات کے لیے دیا جاتا ہے۔ ایسے مال کے لیے اللہ بڑھا چڑھا کر لوٹانے اور اس کی وجہ سے گناہوں کو معاف کرنے کا وعدہ فرماتا ہے۔ اللہ ہمیں زیادہ سے زیادہ اپنی راہ میں خرچ کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

آیت ۱۸ میں ارشاد ہوا: ﴿عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ﴿۱۸﴾﴾ ''وہ پوشیدہ اور ظاہر کا جاننے والا ہے، زبردست ہے، کمال حکمت والا ہے''۔ ظاہر اور پوشیدہ کی تقسیم ہمارے لیے ہے، اللہ کے لیے سب برابر ہے، اللہ عزیز ہے، یعنی کُل اختیار رکھتا ہے لیکن وہ حکیم بھی ہے، یعنی اپنے اختیار کو کمال حکمت کے ساتھ استعمال کرتا ہے۔

❁❁❁

غیبت اور بہتان

پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

غیبت اور بہتان کبیرہ گناہ ہیں۔ یہ زبان سے صادر ہونے والے وہ گناہ ہیں جنہیں عام طور پر کوئی اہمیت نہیں دی جاتی' حالانکہ ان کا ارتکاب اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اور حقوق العباد کی تلفی ہے۔ ان کی بُرائی اور شناعت قرآن مجید میں واضح طور پر بیان کی گئی ہے اور رسول اللہ ﷺ کے فرمودات میں ان سے بچنے کی مؤثر انداز میں تلقین کی گئی ہے۔ یہ دونوں زبان سے صادر ہونے والے گناہ ہیں۔ زبان ایسی چیز ہے جو انسان کو باقی مخلوقات کے مقابلے میں اشرف بناتی ہے۔ اس کا غلط استعمال کرنے والا انسانیت کی شرافت سے بے خبر اور اللہ کی نعمت کا ناقدردان ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے زبان کے استعمال میں انتہائی محتاط رہنے کی تعلیم دی ہے۔

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((اِذَا اَصْبَحَ ابْنُ آدَمَ فَاِنَّ الْاَعْضَاءَ كُلَّهَا تُكَفِّرُ اللِّسَانَ فَتَقُوْلُ : اتَّقِ اللّٰهَ فِيْنَا، فَاِنَّمَا نَحْنُ بِكَ، فَاِنِ اسْتَقَمْتَ اسْتَقَمْنَا وَاِنِ اعْوَجَجْتَ اعْوَجَجْنَا)) (سنن الترمذی)

''جب صبح ہوتی ہے تو انسان کے سب اعضاء زبان کے آگے عاجزی کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمارے معاملے میں اللہ سے ڈر' کہ ہم تیرے ساتھ بندھے ہوئے ہیں' تو ٹھیک رہی تو ہم بھی ٹھیک رہیں گے اور اگر تو نے غلط روی اختیار کی تو ہم بھی غلط روی اختیار کریں گے (اور پھر اس کا خمیازہ بھگتیں گے)۔''

غیبت یہ ہے کہ کسی شخص کی بُرائی اس کی پیٹھ پیچھے یعنی غیر موجودگی میں بیان کی جائے بایں طور کہ یہ بات اگر اس کے سامنے کی جاتی تو وہ اسے پسند نہ کرتا۔ کسی کا عیب اس کی عدم موجودگی میں لوگوں تک پہنچانا غیبت ہے۔ اگر کسی شخص کی خامی معلوم ہو جائے تو اس پر پردہ ڈالنے کا حکم ہے' نہ یہ کہ اسے بدنام کیا جائے۔ یہ طرزِ عمل نہایت پسندیدہ ہے۔ رسول اللہ ﷺ

کا فرمان ہے:

((مَنْ سَتَرَ مُسْلِمًا سَتَرَهُ اللّٰهُ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ)) (صحیح مسلم' عن ابی ہریرۃ رضی اللہ عنہ)

''جو شخص کسی مسلمان کی عیب پوشی کرے گا' اللہ تعالیٰ دنیا و آخرت میں اس کی عیب پوشی فرمائے گا۔''

قیامت کے دن جس کی پردہ پوشی کر دی گئی وہ تو بڑا خوش نصیب ہے' لہٰذا اس دن کی رسوائی سے بچنے کے لیے دنیا کی زندگی میں دوسروں کے عیب چھپانا ضروری ہے۔ دوسروں کے عیب بیان کرنا قیامت کے دن کی رسوائی کا سبب ہے۔

غیبت اور بہتان کو واضح کرتے ہوئے نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ''کیا تم جانتے ہو غیبت کیا ہے؟'' صحابہؓ نے عرض کیا: اللہ اور اس کا رسول ﷺ زیادہ جانتے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا: ((ذِكْرُكَ اَخَاكَ بِمَا يَكْرَهُ)) ''(غیبت یہ ہے کہ) تو اپنے بھائی کا ذکر اس طریقے سے کرے جسے وہ ناپسند کرتا ہو''۔ عرض کیا گیا: ''اگر وہ بات (واقعی) ہمارے بھائی میں پائی جاتی ہو جو ہم نے کہی ہو تو؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ((اِنْ كَانَ فِيْهِ مَا تَقُوْلُ فَقَدِ اغْتَبْتَهُ وَاِنْ لَمْ يَكُنْ فِيْهِ فَقَدْ بَهَتَّهُ)) (صحیح مسلم' عن ابی ہریرۃ رضی اللہ عنہ) ''اگر تمہاری کہی ہوئی بات اس میں پائی جاتی ہو تو تم نے اس کی غیبت کی اور اگر وہ اس میں نہ پائی جاتی ہو تو تم نے اس پر بہتان لگایا۔''

غیبت کی برائی جان لینے کے لیے یہی کافی ہے کہ اگر وہ برائی اس کے سامنے بیان کی جاتی تو وہ اس کی وضاحت کرتا اور اس کے لیے موقعہ ہوتا کہ وہ اپنا دفاع کر سکے۔ غیبت وہ گناہ ہے جسے قرآن مجید میں اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھانے سے تشبیہہ دی گئی ہے۔ فرمایا:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ ۫ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ وَّلَا تَجَسَّسُوْا وَلَا يَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا ؕ اَيُحِبُّ اَحَدُكُمْ اَنْ يَّاْكُلَ لَحْمَ اَخِيْهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوْهُ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ تَوَّابٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۲﴾﴾ (الحجرات)

''اے ایمان والو! زیادہ گمان کرنے سے بچو' بے شک بعض گمان گناہ ہوتے ہیں' اور ایک دوسرے کے حالات کی ٹوہ میں نہ رہا کرو اور تم میں سے کوئی کسی کی غیبت نہ کرے۔ کیا تمہارے اندر کوئی ایسا ہے جو اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھانا پسند کرے؟ تم خود اس سے گھن کھاتے ہو۔ اللہ سے ڈرو' بے شک اللہ بڑا توبہ قبول کرنے والا' رحم کرنے والا ہے۔''

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((لَمَّا عُرِجَ بِیْ مَرَرْتُ بِقَوْمٍ لَهُمْ اَظْفَارٌ مِنْ نُحَاسٍ یَخْمُشُوْنَ وُجُوْهَهُمْ وَصُدُوْرَهُمْ، فَقُلْتُ : مَنْ هٰؤُلَاءِ یَا جِبْرِیْلُ؟ قَالَ: هٰؤُلَاءِ الَّذِیْنَ یَاْکُلُوْنَ لُحُوْمَ النَّاسِ وَیَقَعُوْنَ فِیْ اَعْرَاضِهِمْ)) (ابو داؤد عن انس بن مالکؓ)

''جب مجھے معراج پر لے جایا گیا تو میرا گزر کچھ ایسے لوگوں پر ہوا جن کے ناخن تانبے کے تھے جن سے وہ اپنے چہروں اور سینوں کو نوچ نوچ کر زخمی کر رہے تھے۔ میں نے کہا: اے جبریل! یہ کون لوگ ہیں۔ جبریل نے جواب دیا: یہ وہ لوگ ہیں جو لوگوں کا گوشت کھایا کرتے تھے (یعنی ان کی غیبت کیا کرتے تھے) اور ان کی عزتوں سے کھیلا کرتے تھے۔''

رسول اللہ ﷺ نے غیبت کو زنا سے بھی بدتر گناہ بتایا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''غیبت زنا سے بھی زیادہ سخت ہے''۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کہ یہ کیسے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''ایک شخص زنا کرتا ہے پھر توبہ کر لیتا ہے تو اس کا گناہ معاف ہو جاتا ہے اور غیبت کرنے والے کا گناہ اس وقت تک معاف نہیں ہوتا جب تک وہ شخص معاف نہ کرے جس کی غیبت کی گئی''۔ (جامع ترمذی، عن ابی سعیدؓ و جابرؓ)

ایک موقع پر رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((اِنَّ مِنْ اَکْبَرِ الْکَبَائِرِ اسْتِطَالَةَ الْمَرْءِ فِیْ عِرْضِ رَجُلٍ مُسْلِمٍ بِغَیْرِ حَقٍّ))

(سنن ابی داؤد)

''بے شک کسی بندۂ مسلم کی عزت میں ناحق زیادتی کرنا کبیرہ گناہوں میں سے ایک بڑا گناہ ہے۔''

غیبت کرنا تو بہت بڑا گناہ ہے ہی، اسی طرح غیبت سننا بھی گناہ ہے۔ لہٰذا اگر کسی کے سامنے کسی کی غیبت کی جائے تو جس کی غیبت کی جا رہی ہو اس کا دفاع کیا جائے اور غیبت کرنے والے کو غیبت کرنے سے روکا جائے۔ مسند احمد میں ہے کہ جو شخص اس وقت کسی مؤمن کی حمایت کرے جبکہ کوئی منافق اس کی مذمت بیان کر رہا ہو تو اللہ تعالیٰ ایک فرشتے کو مقرر کر دیتا ہے جو قیامت والے دن اس کے گوشت کو نارِ جہنم سے بچائے گا۔ (بحوالہ تفسیر ابن کثیر)

مشکوٰۃ شریف میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

''اگر کسی شخص کے سامنے اس کے مسلمان بھائی کی غیبت ہو رہی ہو اور وہ روکنے پر قدرت رکھتا ہو تو ضرور روک دے۔ (اس روکنے کے سبب) اللہ تعالیٰ دین اور دنیا (کی مصیبتوں) میں اس کی مدد کرے گا۔ اور اگر روکنے کی طاقت رکھنے کے باوجود نہ روکے گا تو اللہ تعالیٰ دنیا اور آخرت میں اس سے (جیسے چاہے) باز پرس کرے گا۔''

اُمّ المؤمنین حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا چھوٹے قد کی تھیں۔ ایک دفعہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے حضرت صفیہؓ کی کوتاہ قامتی کا تذکرہ کیا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((لَقَدْ قُلْتِ کَلِمَةً لَوْ مُزِجَتْ بِمَاءِ الْبَحْرِ لَمَزَجَتْهُ)) (سنن ابی داؤد)

''تم نے ایک ایسی بات کہہ دی ہے کہ اگر اسے سمندر کے پانی میں ملا دیا جائے تو وہ بھی متغیر ہو جائے۔''

سمندر کے بے حد و حساب پانی کو کسی شے کی کتنی مقدار متغیر کر سکتی ہے؟ کوئی بڑی سے بڑی شے بھی نہیں۔ البتہ غیبت اتنی بری چیز ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے بیان کے مطابق غیبت اگر سمندر کے پانی میں ڈال دی جائے تو وہ بھی متغیر ہو جائے۔ چنانچہ غیبت کو معمولی سمجھنا دنیا و آخرت میں اپنی رسوائی کو دعوت دینا ہے۔ اس معاملے میں جتنی بھی احتیاط ہو سکے ملحوظ رکھنی چاہیے، کیونکہ ہر شخص کو عزت مطلوب ہوتی ہے۔ ایک مسلمان کو ہر دوسرے مسلمان کی نہ صرف خود عزت کرنی چاہیے بلکہ اگر کبھی ایسا موقعہ درپیش ہو کہ کسی دوسرے مسلمان کی عزت کو داغدار کیا جا رہا ہو تو بساط کے مطابق اس کا دفاع کرنا چاہیے۔

جیسا کہ اوپر ذکر ہوا کہ غیبت بہت بڑا گناہ ہے، مگر بہتان تو اس سے کہیں بڑا گناہ ہے، کیونکہ غیبت کرنے والا تو جس غیر موجود بھائی کی برائی یا کمزوری کا ذکر کر رہا ہوتا ہے وہ اس میں موجود ہوتی ہے، اور بہتان تو وہ ہے کہ کسی بھائی کے ذمہ وہ بُرائی منسوب کر دینا جو اس میں ہے ہی نہیں۔ اسی لیے بہتان کی سزا اسّی (۸۰) کوڑے ہے جس پر خیر القرون میں عمل بھی ہوا۔

صحیح بخاری میں جن سات ہلاک کرنے والے گناہوں کا ذکر ہے اس میں ان پاک دامن مؤمن عورتوں پر بہتان لگانا بھی شامل ہے جن کے بارے میں انہیں پتہ تک نہ ہو (عن ابی ہریرہؓ)۔ اسلامی تعلیم تو یہ ہے کہ کسی بھائی کا عیب ہو بھی تو اسے چھپایا جائے چہ جائیکہ کسی کے ذمہ ناکردہ گناہ منسوب کیا جائے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((مَنْ رَمٰی مُسْلِمًا بِشَیْءٍ یُرِیْدُ شَیْنَهٗ بِهٖ حَبَسَهُ اللّٰهُ عَلٰی جِسْرِ جَهَنَّمَ

حَتّٰی یَخْرُجَ مِمَّا قَالَ)) (سنن ابی داؤد، عن معاذ بن انسؓ)

''جس شخص نے کسی مسلمان کو رسوا کرنے کے لیے اس پر تہمت لگائی تو اللہ اس کو (قیامت کے دن) دوزخ کے پُل پر قید رکھے گا جب تک کہ وہ اپنی اس بات (تہمت) سے چھٹکارا نہ پالے۔''

بہتان لگانے والا یہ شخص اس وقت تک جہنم کے پُل پر قید رہے گا جب تک اسے وہ شخص معاف نہ کرے گا جس پر اس نے تہمت لگائی ہوگی۔ تہمت لگانے والا شخص قیامت کے دن کی سزا سے ڈرے اور اس گھناؤنے جرم سے زندگی بھر بچا رہے۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

((کُلُّ الْمُسْلِمِ عَلَی الْمُسْلِمِ حَرَامٌ :دَمُہٗ وَمَالُہٗ وَعِرْضُہٗ)) (صحیح مسلم)

''ہر مسلمان کا خون، مال اور عزت و وقار دوسرے مسلمان پر حرام ہے۔''

چند بد باطن منافقوں نے اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ ؓ پر تہمت لگائی اور انہیں صفوانؓ بن معطل کے ساتھ منسوب کیا۔ یہ وہ عائشہ صدیقہ اُمّ المؤمنین ہیں جن کی فضیلت پر صحابہ کرام ؓ نہ صرف متفق ہیں بلکہ اسے اپنے ایمان کا حصہ سمجھتے ہیں۔ کُتبِ احادیث حضرت اُم المؤمنین کی فضیلت پر شاہد ہیں۔ ایک سفر میں حضرت عائشہ رسول اللہ ﷺ کی ہم سفر تھیں۔ قافلے نے ایک جگہ پڑاؤ کیا، اور جب وہاں سے کوچ کیا تو اُمّ المؤمنین رفع حاجت کی غرض سے اپنے ہودج سے نکل کر جنگل کی طرف گئی ہوئی تھیں۔ دریں اثنا سب لوگ جگہ چھوڑ گئے۔ آپؓ کا ہودج اٹھا کر اونٹ پر رکھنے والوں کو بھی معلوم نہ ہوا کہ ہودج خالی ہے۔ اُمّ المؤمنین واپس آئیں تو جگہ خالی تھی۔ آپؓ پریشان ہو کر وہیں لیٹ گئیں۔ حضرت صفوانؓ نے سب سے آخر پر جانا تھا۔ انہوں نے اُم المؤمنین کو اس طرح لیٹے ہوئے دیکھا تو اونٹ پر سوار کر کے لشکر کے ساتھ آ ملے۔ منافقین اور یہود نے اس واقعے کو خوب اچھالا۔ رسول اللہ ﷺ کو اس پر بڑا دکھ ہوا۔ آپؐ کے نیک دل صحابہ اور اُمّ المؤمنین کے ماں باپ بھی سخت پریشان ہوئے۔ کئی دن گزر گئے، بالآخر سورۃ النور کی آیات نازل ہوئیں اور اُمّ المؤمنین کی پاک دامنی پر ربّ العالمین نے مہر لگا دی اور افواہوں کا خاتمہ ہوا۔

آپ ﷺ کے صحابہ میں سے دو صاحبان حضرت مسطح، حضرت حسان بن ثابت اور ایک خاتون حمنہ بنت جحش (آپ ﷺ کی سالی) باطل پراپیگنڈے سے متاثر ہو گئے تھے اور انہوں

نے تہمت لگانے والوں کی تائید کی تھی۔ ان سے خطا ہوگئی۔ ان کے پاس تہمت کے حق میں کوئی شہادت نہ تھی، لہٰذا اسلامی قانون کے مطابق وہ سزا کے مستوجب ٹھہرے۔ یہ بڑے ذی وقار لوگ تھے۔ مسطح بن اثاثہ تو غزوۂ بدر میں شریک تھے۔ حسانؓ شاعر رسولؐ تھے۔ حمنہ اُمّ المؤمنین حضرت زینت بنت جحش ؓ کی بہن تھی۔ چونکہ یہ لوگ بہتان لگانے والوں کے ساتھ شامل ہو گئے مگر چار گواہ پیش نہ کر سکے اور بہتان کا ارتکاب کر بیٹھے، لہٰذا ضابطے کے مطابق ان ذی وقار لوگوں کو بھی سزا کا سامنا کرنا پڑا اور ہر ایک کو اسّی اسّی کوڑے لگائے گئے۔

حاصل تحریر یہ ہے کہ کسی کی غیبت سے کبھی اپنی زبان کو آلودہ نہیں کرنا چاہیے، اس لیے کہ غیبت زنا سے بھی زیادہ سنگین جرم ہے۔ غیبت سے باز رہنے کے ساتھ ساتھ بندہ کسی کی غیبت سننے سے بھی رُکا رہے، بلکہ جس مسلمان کی غیبت کی جائے اس کی عدم موجودگی میں اس کا دفاع کرے۔ بہتان غیبت سے بڑھ کر جرم ہے۔ اگر بہتان لگانے والا چار چشم دید گواہ نہ لا سکا تو وہ خود دنیا میں اسّی کوڑوں کی سزا پائے گا ورنہ آخرت میں عذاب پانے والوں میں ہوگا۔

غیبت کرنے والے کا چھٹکارا اس صورت میں ہے کہ جس کسی کی اس نے غیبت کی ہے اس سے اپنا گناہ معاف کرا لے۔ اگر وہ فوت ہو چکا ہو تو اُس کی بخشش کے لیے دعا کرتا رہے۔ بہتان لگانے والوں کو یہاں اسلامی قانون نہ ہونے کی بنا پر کوڑے نہیں لگتے تو ان کے لیے آخرت کی سزا تو ہے ہی۔ ایسے افراد بھی جس پر بہتان لگا چکے ہیں، اس سے معافی چاہیں اور عاقبت کی سزا سے بچنے کی امید رکھیں۔

کسی کی برائیاں ڈھونڈنے کی بجائے اپنی کمزوریوں پر نظر رکھنا غیبت اور بہتان جیسے گناہوں سے بچائے رکھے گا۔ اگرچہ یہ مشکل ہے، تاہم برے نتائج سے بچنے کے لیے ناگزیر ہے۔ متحدہ ہندوستان کے آخری مسلمان بادشاہ بہادر شاہ ظفر نے یہ حقیقت ان الفاظ میں بیان کی ہے ؎

نہ تھی حال کی جب ہمیں اپنے خبر، رہے دیکھتے لوگوں کے عیب و ہنر
پڑی اپنی برائیوں پر جو نظر تو نگاہ میں کوئی بُرا نہ رہا!

اللہ تعالیٰ ہمیں غیبت، بہتان اور اس جیسی دوسری باطنی برائیوں سے بچنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

❁❁❁

اعلیٰ کامیابی: جنّت کی ڈگری

بیگم ڈاکٹر عبدالخالق

''ہماری بچیاں کیسی تعلیم حاصل کریں''☆ کا دوسرا اور آخری، لیکن تلخ حصہ پیش خدمت ہے۔ پہلا حصہ تو الحمدللہ کافی پسند کیا گیا تھا اور اسی وقت سے ذہن میں یہ چند باتیں موجود تھیں جن کو صفحہ قرطاس پر لاتے ہوئے ہچکچاہٹ محسوس ہو رہی تھی، کیونکہ آج کے دور میں اب ایسی باتیں نہیں سوچی جاسکتیں۔ چونکہ مجھے اس میں حقیقت نظر آ رہی تھی (اور حقیقت ہمیشہ کڑوی ہی ہوتی ہے)، لہٰذا اللہ سے دعا کرتے ہوئے میں اپنا نظریہ پیش کرتی ہوں۔ لیکن اس سے پہلے میں سب قارئین سے درخواست کروں گی کہ اگر یہ باتیں صحیح ہیں تو دعا بھی ضرور کریں اور ان باتوں پر عمل کرنے کا بھی سوچیں، اور اگر باتیں غلط ہیں (اور آپ کو پورا حق ہے اختلافِ رائے کا) تو آپ قرآن وسنت کے حوالے سے میری رہنمائی کریں۔ باقی یہ ضرور ذہن میں رہے کہ کُل پر یہ باتیں منطبق نہیں کی جاسکتیں، اس لیے کہ استثناءات ہر جگہ موجود ہیں، لہٰذا یہ تحریر سب پر منطبق (apply) نہیں ہوتی —— اور آج بھی ماشاءاللہ ایسے لوگ موجود ہیں ع

کرتے ہیں اشکِ سحر گاہی سے جو ظالم وضو!

ہر چیز کو 'بنانے' کا ایک مقصد ہوتا ہے، چاہے وہ چیز انسان کی بنائی ہوئی ہو یا خالقِ کائنات کی، اور پھر بنائی ہوئی چیز کو اسی مقصد کے لیے استعمال کیا جائے جس کے لیے وہ بنائی گئی ہے تو ٹھیک ہے، وگرنہ وہ کوڑے کرکٹ کی نذر ہو جاتی ہے۔ مثلاً میز بنائی تو تھی کتابوں کے رکھنے کے لیے یا پھر کھانے وغیرہ کے لیے، لیکن بنانے کے بعد میز پر بیٹھنا شروع کر دیا جائے تو یقیناً وہ جلد ہی ٹوٹ جائے گی اور بے کار ہو جائے گی۔ اسی طرح خالقِ کائنات نے نباتات، جمادات، حیوانات، چرند پرند اور انسان مختلف مقاصد کے لیے پیدا کیے اور اللہ ربّ العزت نے انسان کو پیدا کیا اپنی بندگی کے لیے۔ سورۃ الذّاریات میں اللہ تعالیٰ نے فرما دیا: ﴿وَمَا خَلَقْتُ

(۱) یہ مضمون میثاق شمارہ مارچ ۲۰۱۶ء میں شائع ہوا تھا۔

الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ﴿۵۶﴾ ''اور میں نے نہیں پیدا کیا جنّوں اور انسانوں کو مگر صرف اس لیے کہ وہ میری بندگی کریں''۔ بندگی کا مطلب ہے غلامی اور انسان ہوا اللہ کا غلام۔ اب غلام اپنی مرضی سے کچھ نہیں کرسکتا، سب اپنی آقا کی مرضی سے کرتا ہے۔ وہ آقا کی مرضی کے مطابق کام کرے تو ٹھیک اور اگر اپنی مرضی سے کرے تو راندۂ درگاہ ہوگا اور کوڑا کرکٹ کا ڈھیر بن جائے گا، جن کو ﴿كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ﴾ (الاعراف:۱۷۹) بھی قرآن نے ہی کہا ہے۔ گویا اگر مرد کو مرد اور عورت کو عورت بنایا ہے اور نسلوں کی بقا کا انحصار ان دونوں کے اشتراکِ عمل کی وجہ سے ہی ہے تو آج خاندانوں میں بندگیٔ ربّ کے ضمن میں کہاں فساد اور بگاڑ پیدا ہو رہا ہے کہ خاندانوں کے خاندان ﴿ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ اَيْدِي النَّاسِ﴾ (الروم:۴۱) کی منہ بولتی تصویر بن چکے ہیں۔ والدین (ماں باپ)، اولاد، میاں بیوی، گھر، خاندان کے ادارے، یہ سب آج بے حد مایوسی اور ڈپریشن کا شکار ہیں تو کیوں؟ مجھے جو وجوہات نظر آتی ہیں وہ آپ کے سامنے رکھ رہی ہوں کہ عورتوں کو اس حوالے سے کیا اشکالات ہیں۔

سب سے پہلا اشکال یہ ہے کہ مرد اور عورت کو الگ جنس کیوں پیدا کیا گیا؟ اس کا جواب تو قرآن ایک ہی آیت میں دے دیتا ہے: ﴿اَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ﴾ (الملک:۱۴) ''کیا وہی نہ جانے گا جس نے پیدا کیا ہے''۔ اس تخلیق کے اختلاف میں خالق، الباری، المصوّر کے کیا کیا کمالات ہیں، ہم نہیں جان سکتے۔ سورۃ الاعلیٰ میں فرمایا: ﴿الَّذِيْ خَلَقَ فَسَوّٰى ﴿۲﴾ وَالَّذِيْ قَدَّرَ فَهَدٰى ﴿۳﴾﴾ ''جس نے (ہر چیز کو) پیدا کیا، پھر تناسب قائم کیا۔ اور جس نے (ہر شے کا) اندازہ مقرر کیا، پھر اسے (فطری) ہدایت عطا فرمائی۔''

اسی طرح ایک اعتراض یہ بھی ہے کہ پیدا کر ہی دیا ہے تو ہم اپنی مرضی سے اپنے آپ کو کیوں نہیں استعمال کر سکتے؟ تیسرا اعتراض آج کی نوجوان نسل خصوصاً لڑکیوں کو یہ ہے کہ جو تعلیم مرد حاصل کر رہے ہیں (حالانکہ ننانوے فیصد مرد صرف آمدنی کے لیے پڑھتے ہیں اور عورت کو اس ذمہ داری سے آزاد رکھا گیا ہے) وہ عورت بھی کیوں نہ حاصل کرے؟ اور وہ مرد کی طرح کیوں آزادانہ باہر نہیں پھر سکتی؟ یا مرد کمائی کرتا ہے تو وہ کیوں نہ کرے؟ کیونکہ مرد کی ایک درجے فضیلت کمائی کرنے کی وجہ سے ہے تو مجھے بھی وہ فضیلت حاصل ہو جائے یا پھر میں بھی کمائی کروں تاکہ اس کے برابر ہو جاؤں؟ یا یہ کہ صرف عورت کو ہی کیوں گھر بیٹھنے کے لیے

کہا گیا ہے؟ مرد گھروں میں بیٹھیں اور ہمیں کوئی پوچھنے والا نہ ہو وغیرہ وغیرہ۔

ان تمام اعتراضات کا ایک جواب تو خالق کائنات نے خود ہی دے دیا جو میں بیان کر چکی ہوں کہ ﴿اَلَا یَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ ؕ﴾ باقی یہ کہ مرد بھی اللہ نے پیدا کیے اور عورتیں بھی اُس کی تخلیق ہیں اور مقصدِ حیات یعنی ''بندگی'' بھی تعلیم حاصل کیے بغیر ناممکن ہے' لیکن تعلیم ہم اپنی مرضی سے حاصل کر ہی نہیں سکتے۔ ہر مشین کی طرح ہمارے جسم کی مشین کے لیے گائیڈ قرآن پاک ہے اور پہلی وحی کا آغاز ہی ان الفاظ سے ہوا:

﴿اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ ۝ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۝ اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ ۝ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۝﴾ (العلق)

''پڑھیے اپنے اُس رب کے نام سے جس نے پیدا کیا۔ انسان کو پیدا کیا ہے اُس جونک کی طرح کی چیز سے جو رحم مادر میں چمٹ گئی تھی۔ پڑھیے اور آپ کا ربّ بہت کریم ہے۔ جس نے تعلیم دی ہے قلم کے ساتھ۔''

ان الفاظ میں یہ بات بہت واضح ہو کر سامنے آتی ہے کہ مرد و عورت دونوں کے لیے علم کس قدر ضروری ہے' لیکن جب ہم بندگی اس کی مرضی کے بغیر نہیں کر سکتے تو ہم علم بھی اس کی مرضی کے بغیر حاصل نہیں کر سکتے۔ خصوصاً عورت کا تعلیم یافتہ ہونا ضروری ہے۔ ایک دینی' یعنی قرآن و حدیث اور اخلاقیات کا علم اور دوسرا دنیوی' یعنی جدید علوم سے آراستہ و پیراستہ ہونا۔ ثابت ہوا کہ تعلیم تو دونوں کے لیے ضروری ہے' لیکن کیسی تعلیم لڑکیوں کی؟ یہ میں پچھلے مضمون میں الحمدللہ اچھی طرح واضح کر چکی ہوں۔ مزید آگے واضح کروں گی اور یہ کہ یہ تعلیم کہاں حاصل کی جائے؟ آج کے سائنسی دور میں گھروں میں بیٹھ کر online تعلیم حاصل کرنا کچھ مشکل نہیں رہ گیا' اس کے لیے باہر نکلنے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ آج کل تو مرد حضرات کمائی بھی online کر رہے ہیں تو خواتین آن لائن تعلیم کیوں نہیں حاصل کر سکتیں؟ اصل بات یہ ہے کہ تعلیم حاصل کرنا ہی شوق اور مقصد ہو' نہ کہ گھروں سے باہر نکلنے' نئے نئے کپڑے سلوا کر پہننے اور خرچے بڑھانے اور زیادہ سے زیادہ وقت گھر سے باہر رہنے کا بہانہ ہو۔ اور آج یہی مسئلہ ہے کہ صنف نازک کسی طرح گھروں میں بیٹھنا پسند نہیں کرتی۔ علامہ اقبال تو فرماتے ہیں ؎

بتولے باش و پنہاں شو ازیں عصر کہ در آغوش شبیرے بگیری!

''حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا (جیسی) بن جاؤ اور اس زمانے سے چھپ جاؤ کہ تمہاری گود میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ (جیسے بچے) پروان چڑھیں۔''

اپنے ذہنوں میں ہمیشہ ان خواتین کو رول ماڈل بنا کر رکھیں جن سیّدات کے پاس جنت کی ڈگریاں ہیں جو کہ سب سے اعلیٰ ہیں۔ اپنے ماحول' اپنے حالات اور اپنے مزاج کو ان روشن ستاروں ـــــ حضرت آسیہ' حضرت مریم' اُمّ المؤمنین حضرت خدیجہ' حضرت عائشہ صدیقہ' اور حضرت فاطمۃ الزہراء (رضی اللہ عنہن) ـــــ میں سے کسی ایک کے حالات کو اپنے سے قریب رکھتے ہوئے ان کی پیروی کرنی شروع کر دیں۔ یہ سب سے اعلیٰ درجے (top) کی تعلیم ہے۔ اس کو حاصل کرنے سے جنت کی ڈگری ملے گی۔ اس کے ساتھ دنیا کی تعلیم بھی حاصل کریں جو میں پہلے بیان کر چکی ہوں۔ خدارا اپنے آپ کو اس دھوکے سے نکالیں کہ ہم فلاں فلاں ملازمت (job) کر کے خدمت خلق کریں گی۔ اچھی طرح جان لیں کہ ہر انسان کی جنت اللہ ربّ العزت نے اس کی ذمہ داریوں (فرائض) کی احسن طریقے سے ادائیگی میں رکھ دی ہے۔ یہ فرائض ہیں' جب کہ نوافل کی باری تو بہت بعد میں آتی ہے جب آپ ان گھریلو ذمہ داریوں سے فارغ ہو جائیں۔ ہم من جانب اللہ اپنے فرائض سے پہلوتہی اور انہیں قربان کر کے (یعنی شوہر داری' گھر داری' بچہ داری) گھروں سے باہر نکل کر خدمت خلق کے کاموں میں اپنے آپ کو کھپا کر کیا جنت سے بھی کچھ آگے جانے کی سوچ رہے ہیں؟ یہ احمقانہ سوچ ہے۔ ایک حدیث مبارکہ کے الفاظ ہیں:

((اِذَا صَلَّتِ الْمَرْاَۃُ خَمْسَهَا وَصَامَتْ شَهْرَهَا وَحَصَّنَتْ فَرْجَهَا وَاَطَاعَتْ بَعْلَهَا دَخَلَتْ مِنْ اَیِّ اَبْوَابِ الْجَنَّةِ شَاءَتْ))

(رواہ ابن حبان والطبرانی)

''جب عورت اپنی پانچ نمازیں ادا کرے' اپنے ماہِ رمضان کے روزے ادا کرے' اپنی عصمت کی حفاظت کرے اور اپنے شوہر کی اطاعت کرے تو (اسے اختیار ہے کہ وہ) جنت کے جس دروازے سے چاہے داخل ہو جائے۔''

اس کے برعکس اگر ہم اپنے فرائض کو چھوڑ کر نیکی اور خدمتِ خلق کے جذبے سے نوافل ادا کرنے کی کوشش کریں گے تو پھر جنت کو بھلانا پڑے گا۔

اس ضمن میں ایک مشکل بلکہ انتہائی کڑوے مسئلے کی طرف توجہ دلانا ضروری سمجھوں گی۔ ہم کہتے ہیں کہ لڑکیوں کو میڈیکل میں تو جانا ہی چاہیے تاکہ عورتوں کا علاج خصوصاً گائنی کا کام تو سنبھال سکیں‘ جبکہ اللہ تعالیٰ جو فاطر فطرت ہے اور عورت کی حیا سے واقف ہے‘ اس نے عورتوں کو مرد ڈاکٹروں سے علاج کی اجازت دے رکھی ہے کہ متاثرہ حصہ کھول کر علاج کروا سکتی ہیں۔ عام حالات میں ہم کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی سہولت سے فائدہ اٹھانا بھی ثواب ہے‘ تو ہمیں اس مقام پر یہ بات کیوں بھول جاتی ہے؟ دوسرے یہ کہ لڑکیوں نے لڑکوں کی سیٹیں لے کر میڈیکل اور اس سے متعلق مختلف فیلڈز کی ڈگریاں تو حاصل کی ہوئی ہیں مگر بہت سی لڑکیاں پروفیشن میں نہیں آتیں‘ جب کہ اکثر صرف اس لیے کمائی کر رہی ہیں کہ جیب خرچ پورا ہو جائے یا اپنے شوق پورا کرنے کے لیے اور سب سے بڑھ کر اپنے گھروں‘ بچوں اور شوہروں کی ذمہ داریوں کی قربانی دے کر— لیکن المیہ یہ ہے کہ عورتوں کے آج بھی زیادہ تر علاج لیڈی ڈاکٹرز کے بجائے مرد ڈاکٹرز سے ہی کروائے جاتے ہیں۔ مردوں سے علاج کروانے میں عورت کو کوئی گناہ نہیں ہے‘ البتہ اگر ڈاکٹر غلط نگاہ یا نیت سے دیکھے تو اسی کو گناہ ہے۔ سوچنے کی بات ہے کہ کیا اللہ تعالیٰ کو (نعوذ باللہ) معلوم نہیں تھا کہ عورتوں کو ہی عورتوں کا علاج کرنا چاہیے اور اس کے لیے لڑکیوں کا ڈاکٹر بننا ضروری ہے؟ کیا ہم اللہ تعالیٰ سے زیادہ حیا جانتے ہیں؟ یا آج کی عورت پہلے کی نسبت زیادہ حیادار ہے کہ وہ مردوں سے علاج نہیں کروا سکتی؟ لہٰذا عورتوں کو ان کی اصل ذمہ داری سے ہٹا کر یہ خدمتِ خلق کروانا کیا زیادہ باعثِ ثواب اور ضروری ہے اور اس کے لیے مخلوط تعلیم دلوانا کیا بھلائی اور خیر کے زمرے میں آتا ہے؟ افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اکثر خواتین مرد ڈاکٹروں سے علاج کروانے کے لیے میک اپ کے بغیر نہیں جاتیں‘ حالانکہ اپنے شوہر کے علاوہ کسی اور کے لیے سجنا سنورنا گناہ ہے۔

بہرحال معاشی طور پر اگر مرد کا ہاتھ بٹانا مقصود ہو تو کمپیوٹر پر online اور گرلز سکول میں ٹیچنگ کرنا ایسی فیلڈز ہیں جو لڑکوں کے اختلاط اور مخلوط تعلیم کے بغیر بھی اختیار کی جا سکتی ہیں۔ پھر یہ بھی ہے کہ عورت بچوں اور بچیوں کو مَردوں کی نسبت اچھے طریقے سے پڑھا بھی سکتی ہے اور ان کے اخلاقی اور نفسیاتی معاملات کو بخوبی سمجھ بھی سکتی ہے۔ اسی طرح میڈیکل کی تعلیم حاصل کرنے کا اگر بہت ہی شوق ہے تو مخلوط تعلیم کے بجائے صرف لڑکیوں کے کالج میں اور

اس نیت سے پڑھیں کہ آگے ان کی اولاد اور اہل خانہ کے کام آئے گی یا شوہر کی اجازت سے فارغ اوقات میں ہی علاج کروں گی کہ نہ گھر ڈسٹرب ہو‘ نہ شوہر اور بچے‘ تو پھر تو بات سمجھ میں آتی ہے‘ لیکن اس دوہری مشقت (سروس+اپنے فرائض) سے خود عورت کی اپنی صحت کے جو حالات ہوتے ہیں وہ ان کے چہروں سے عیاں ہوتے ہیں۔ صرف شوقیہ یا پاکٹ منی کے چکر میں گھروں سے باہر آنے کو ترجیح دینا درحقیقت اس مصرعے کا مصداق بننے کے مترادف ہے: ع

نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم‘ نہ اِدھر کے ہوئے نہ اُدھر کے رہے!

یہ ایک انتہائی کڑوا سچ ہے کہ باہر ملازمت کر کے چونکہ عورتوں کو پیسے ملتے ہیں‘ اس لیے وہ دوسروں کو اچھا اخلاق بھی قیمتاً دیتی ہیں اور وہ مسکراہٹیں بھی بیچتی ہیں‘ جیسا کہ ایئر ہوسٹس‘ بس ہوسٹس‘ ریسپشنسٹ وغیرہ۔ دوسری طرف ان عورتوں کے شوہر اور اہل خانہ عورت کی مسکراہٹ اور اچھے اخلاق کو ترس جاتے ہیں۔ افسوس آج ان کے گھروں کا یہ حال ہے کہ نہ اپنے گھروں کو سکون دے سکیں‘ نہ شوہر اور بچوں اور اہل خانہ کو اچھے اخلاق اور مسکراہٹیں بانٹ سکیں‘ بلکہ بہترین تعلیم حاصل کرنے کے بعد جب شوہروں والیاں بن جاتی ہیں اور گھر داری‘ بچہ داری اور شوہر داری جیسی ذمہ داریاں بغیر کسی قیمت کے ادا کرنی پڑتی ہیں‘ تو وہ ان پر بہت گراں گزرتی ہیں‘ کیونکہ شادی سے پہلے کی ساری بہترین عمر اور توانائیاں عام ڈگریوں (جو کہ ان کی اصل ڈگریاں نہیں تھیں) کے حصول میں گزار دی تو کہتی ہیں کہ ’’ہائے اس شوہر نے تو ہماری کوئی قدر ہی نہیں کی‘ ہم پڑھے لکھے کن جاہلوں کے پلے پڑ گئے‘‘ وغیرہ وغیرہ۔ یہ میں آپ کو حقائق بتا رہی ہوں اور حقائق ہمیشہ تلخ ہی ہوتے ہیں۔ سوشل ورکرز اور دوسری ملازمتیں کرنے والی خواتین سے پوچھ کر دیکھیں کہ ان کی اکثریت کی خاندانی زندگی کتنی کرب اور اذیت کا شکار ہے۔

کمائی کرنے والی عورت کا ایک المیہ یہ بھی ہے کہ جب مرد دیکھتے ہیں کہ عورت کما رہی ہے تو وہ بھی اپنی ذمہ داریوں کو کما حقہٗ ادا کرنے سے گریز کرتے ہیں اور ان میں سے اکثر کی نظر عورت کی کمائی پر ہوتی ہے کہ کماتی ہے تو خرچ بھی کرے‘ حالانکہ اصولاً اور شرعاً یہ مرد کی بالکل غلط سوچ ہے۔ پھر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ عورت چاہے کما رہی ہو اور گھر‘ بچے‘ شوہر عورت ہی کے ہیں‘ لیکن اپنی محنت کی کمائی کو گھر میں خرچ کرنا عورت پر بے حد گراں گزرتا ہے‘ جبکہ مرد کماتا

ہی گھر‘ بچوں اور بیوی کے لیے ہے۔شادی کے بعد اکثر مردوں کو دیکھا گیا ہے کہ خود اپنے کپڑے اور جوتے وغیرہ یا تو خریدتے ہی نہیں (عورتوں کی نسبت) یا بہت احتیاط اور کفایت شعاری سے خریدتے ہیں اور اکثر (ساری نہیں) بیویاں مالِ مفت دلِ بے رحم کے مصداق ان کا مال ہضم کر کے بھی ناشکری کرتی ہیں اور اپنی کم مائیگی کا رونا روتی ہیں۔کم کپڑوں پر‘ سادہ کھانے پر‘ عام سے گھر پر‘ تھوڑے سے زیورات پر‘ عام سے شوہر پر (جو اسے ہمیشہ بے وقوف لگتا ہے) عورت کو ہمیشہ شوہر سے گلہ ہی رہتا ہے۔ایک محاورہ بنا ہوا ہے کہ ”رن قصوردی‘ نالے کھاندی نالے گھوردی“۔حالانکہ یہ خاصہ صرف قصور کی عورت کا نہیں‘ بلکہ ہر ناشکری عورت کا وطیرہ یہی ہوتا ہے کہ مرد کی کمائی بھی کھاتی ہے اور اس پر اپنے غصے کا اظہار بھی کرتی ہے۔

نبی پاک ﷺ نے اگر عورتوں کی اکثریت کو جہنم میں دیکھا تھا تو وہ اسی وجہ سے تھا کہ بیوی اپنے شوہر کی کم ہی شکرگزار ہوتی ہے‘ چنانچہ وہ جہنم میں اللہ کی ناشکری کی وجہ سے نہیں بلکہ شوہر کی ناشکری کی وجہ سے جائے گی۔ بہرحال جملہ معترضہ کے طور پر یہ بات آ گئی—— ہم تو تعلیم اور کمائی کی بات کر رہے ہیں۔سوال یہ ہے کہ عورت تعلیم حاصل کرنے کے بعد کمائی کیوں کرتی ہے؟ معاشی طور پر شوہر اگر کمزور ہے تو واقعی اس عورت کی ہمت ہے کہ گھر بھی سنبھالا ہوا ہے‘ بچے بھی پیدا کر کے پرورش کر رہی ہے اور پھر مرد کے ساتھ معاش میں بھی ہاتھ بٹا رہی ہے اور اپنی آمدنی گھر پر بھی لگا رہی ہے۔لیکن اگر وہ صرف اپنی تعلیم جو اُس نے اپنے والدین کے گھر حاصل کی‘ جس کا نہ والدین خصوصاً والدہ نے کوئی فائدہ اٹھایا‘ نہ ان کی خدمت کر سکی‘ نہ ہی اس تعلیم نے گھر گرہستی سکھائی‘ اس تعلیم کے ذریعے جو پیسہ عورت کماتی ہے‘ اگر گھر پر لگا بھی دیتی ہے تو اس کا دل چاہتا ہے کہ شوہر کی گردن سارا دن احسان کے بوجھ سے اس کے آگے جھکی رہے۔لہٰذا لڑکی کا کام ہے کہ وہ شادی سے پہلے جنت حاصل کرنے والی ڈگریوں‘ مثلاً قرآن و حدیث‘ اسلامیات‘ فلسفہ‘ ہوم اکنامکس کی تعلیم ضرور حاصل کرے اور سب سے بڑھ کر صحابیاتؓ کے واقعاتِ زندگی کو پڑھ کر ان کے مطابق اپنی زندگی گزارنا شروع کرے۔اللہ تعالیٰ سورۃ اللیل میں فرماتے ہیں:

﴿وَالَّیۡلِ اِذَا یَغۡشٰی ﴿۱﴾ وَالنَّہَارِ اِذَا تَجَلّٰی ﴿۲﴾ وَمَا خَلَقَ الذَّکَرَ وَالۡاُنۡثٰۤی ﴿۳﴾ اِنَّ سَعۡیَکُمۡ لَشَتّٰی ﴿۴﴾﴾

”قسم ہے رات کی جب وہ ڈھانپ لیتی ہے۔اور قسم ہے دن کی جب وہ روشن ہو جاتا ہے۔اور (قسم ہے) اُس کی جو اُس نے پیدا کیے نر اور مادہ۔ بے شک تمہاری کوشش الگ الگ ہے۔“

ان آیات کی تشریح تو مفسّرین کا ہی کام ہے‘ لیکن ایک نکتہ جو قابلِ غور ہے وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے رات اور دن کی مثال دینے کے ساتھ ساتھ مذکّر اور مؤنّث کی تخلیق اور ان کے دائرۂ کار میں واضح فرق بھی بتایا ہے ”اِنَّ سَعۡیَکُمۡ لَشَتّٰی“ بیان کر کے۔ان حقائق کو کون جھٹلا سکتا ہے کہ فاطرِ فطرت سے بڑھ کر کون جانتا ہے کہ عورت بچے پیدا کرنے کے علاوہ بھی بہت سے مقامات پر مردوں سے بہت مختلف ہے۔وہ عقل‘ جذبات‘ احساسات‘ اپنی تخلیق کے اعتبار سے پیدائشی طور پر مرد سے مختلف ہے۔ان وجوہات کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے اس کو گھر کی ملکہ بنایا ہے اور مرد کو اُس کی‘ اُس کے بچوں کی اور گھر کی تمام ضروریات پورا کرنے کی ذمہ داری دے دی ہے۔ بات صرف اتنی ہے کہ عورت اپنے دائرۂ کار کے اندر اپنے آپ کو پردے میں چھپا کر بھی اپنی خداداد صلاحیتیں اور فرائض نہ صرف یہ کہ دنیا میں اچھے طریقے سے نبھا سکتی ہے اور بچوں کی بہترین تربیت کر کے روشن مقام حاصل کر سکتی ہے‘ بلکہ وہ جنت کی سردار عورتوں کی ساتھی بن سکتی ہے۔

اگر ہم یہ ارادہ اور مقصدِ حیات متعین کر لیں کہ حضرت فاطمہ ؓ کی ہی پیروی کرنی ہے تو معلوم ہو گا کہ گھر بھی جنت کا نمونہ پیش کرنے لگے گا اور عورت بہترین بیوی‘ بہترین ماں‘ بہترین بیٹی اور آخرت میں جنت کو لیڈ (lead) کرنے والی خاتون کی ہمراہی میں ہو گی۔حضرت فاطمہ ؓ دنیا کے سردار پیغمبرِ اعظم ﷺ اور کامیاب ترین انسان کی شہزادی تھیں —— جن کے بارے میں پیارے رسول ﷺ فرماتے کہ ”فاطمہ میرے جگر کا گوشہ ہے“—— انہوں نے جو اختیاری فقر اختیار کیا ہوا تھا‘ ہم میں سے وہ کون کر سکتا ہے۔جو شرم و حیا ان کے اندر تھی وہ ہم میں سے کس میں ہو گی؟ حضرت فاطمہ ؓ کا یہ قول مسلمان خواتین کے لیے مشعل راہ ہے کہ ”عورت کے حق میں سب سے بہتر شے یہ ہے کہ نہ اس پر کسی (نامحرم) مرد کی نگاہ پڑے اور نہ وہ کسی (نامحرم) مرد کو دیکھے۔“ ماں ایسی تھی کہ حسن و حسین ؓ جیسے مجاہد اور شہید ان کی گود میں پروان چڑھے۔ بیوی ایسی تھی کہ انتہائی فقر و فاقہ میں بھی شوہر سے کبھی گلہ نہ کیا اور نہ کبھی اُن کی کسی بات پر اُف

کہا‘ نہ کبھی شوہر سے کوئی فرمائش کی۔ خدارا تمام عورتیں ہر رشتے میں ان کے نقوشِ پا کی پیروی کریں‘ اپنے اسلاف اور ان صحابیاتؓ کی طرف لوٹ جائیں جو آخرت کی طالبات تھیں ؎

فضائے بدر پیدا کر فرشتے تیری نصرت کو
اُتر سکتے ہیں گردوں سے قطار اندر قطار اب بھی!

ذرا سوچیں کہ آج کی تعلیم یافتہ عورت جدیدیت کا لبادہ اوڑھ کر اور دنیا کی اعلیٰ سے اعلیٰ ڈگریاں لیے ہوئے بھی کیوں ذلیل ہو رہی ہے‘ ستائی جا رہی ہے اور مظلومیت کا رونا رو رہی ہے؟ اس کی وجہ مجھے تو یہی سمجھ آئی ہے کہ اپنے دائرۂ کار سے اس نے اپنا رخ بالکل موڑ لیا ہے۔ دوسرے لفظوں میں اللہ کی رضا پر راضی نہیں ہے۔ اسی طرح علمی میدان میں بھی ناکام ہو چکی ہے‘ کیونکہ اپنے دائرۂ کار کے حوالے سے جو اخلاقی تعلیمات ـــــ مثلاً صبر‘ تحمل‘ برداشت‘ پیار محبت‘ اخلاقِ حسنہ‘ محبت کرنے والی‘ قناعت پسند‘ بہادر‘ ہمدرد‘ عفو و درگزر کرنے والی ـــــ حاصل کرنا تھیں اس کے بجائے آزادیٔ نسواں اور مساواتِ مرد و زن کے نام پر کہیں اور ہی چل پڑی ہے۔ عام فہم بات ہے کہ علم کی قسموں میں سے علم الادیان تو مرد و زن دونوں کے لیے دنیا اور آخرت کے حوالے سے ناگزیر ہے‘ لیکن جہاں تک علم الابدان کا تعلق ہے تو اس کے بارے میں‘ میں پھر آغاز کی طرف آؤں گی کہ جو چیز جس مقصد کے لیے بنائی گئی ہے اس کو اسی سے متعلق علم سکھانا چاہیے۔ اگرچہ علم کا میدان کھلا ہے‘ لیکن علمِ نافع وہی علم ہے جو عورت کے مستقبل میں اس کے کام آئے۔

آج کے دور میں اصل بہادری اور عقل مندی یہ نہیں کہ بچیاں ڈاکٹرز‘ انجینئر بنیں یا ایم بی اے‘ سی اے یا کوئی اور اونچی ڈگری حاصل کر لیں اور پھر اپنے سٹینڈرڈ اور آئیڈیل کی تلاش اور انتظار میں بیٹھی رہ جائیں۔ بلکہ اصل دیانت داری اور عقل مندی کا تقاضا یہ ہے کہ بچیوں کو ان کا اصل مقام دکھایا‘ بتایا اور سکھایا جائے اور ایسے ادارے وجود میں آئیں جو ان کے مستقبل کے مسائل کا حل قرآن و حدیث کی روشنی میں پیش کر سکیں۔ گھروں میں سکون لانے کا واحد یہی ذریعہ ہے۔ دینی اعتبار سے صرف قرآن کی حافظہ‘ مدرسہ‘ قاریہ‘ مفتی اور عالمہ ہونا بھی اس کا حل نہیں ہے۔ اس کا حل تو خواتین اور بچیوں کو ان کے اصل مقام کے بارے میں آگاہی دینا اور ان کو مطمئن کرنا ہے اور یہ سب پانے کے لیے ہمیں اپنے اسلاف کی طرف لوٹنا ہوگا۔

اس ضمن میں یہ بھی نوٹ کر لیں کہ مغرب میں بھی لوگ زندگی گزار رہے ہیں۔ مساواتِ مرد و زن اور آزادیٔ نسواں کا عملی نمونہ ہمیں وہاں نظر آتا ہے کہ مرد کے ساتھ کندھا ملا کر عورت تعلیم حاصل کرتی ہے‘ پھر کمائی کرتی ہے‘ اپنے خورد و نوش کا بندوبست خود اپنی جیب سے کرتی ہے۔ گویا عورت کے لیے نہ صرف یہ کہ کوئی خاص دائرۂ کار نہیں ہے‘ بلکہ اس کی قسمت میں مشقت ہی مشقت ہے۔ اس پر مستزاد کہ بچے بھی اسی نے پیدا کرنے ہیں۔ عورت ہر میدان میں مرد کے ساتھ کام کرتی ہے‘ لیکن مرد عورت کے دردِ زہ میں بھی شرکت نہیں کر سکتا‘ جب کہ عورت نے مرد کے ہر کام میں ٹانگ اڑا رکھی ہے۔ بس جو کام وہ نہیں کرتی‘ وہ خانہ داری‘ شوہرداری اور بچے داری ہے۔

افسوس یہ ہے کہ آج مسلمان عورت جس پر اللہ نے کوئی اضافی ذمہ داری نہیں ڈالی‘ وہ اپنے آپ پر خود ظلم کر رہی ہے۔ بے شک زندگی اس طرح بھی گزر جائے گی جیسی کہ مغرب میں گزر رہی ہے‘ لیکن ہم مسلمان عورتیں قرآن کے احکامات کو پس پشت ڈال کر زندگی گزارتے ہوئے کون سی جنت کما لیں گی۔ ہمارے رب نے تو فرمایا ہے: ﴿وَقَرْنَ فِیْ بُیُوْتِکُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِیَّةِ الْاُوْلٰی﴾ (الاحزاب:۳۳) ’’اپنے گھروں میں قرار پکڑو اور پہلی جاہلیت کی سی سج دھج نہ دکھاتی پھرو‘‘۔ آج کی مسلمان نوجوان عورتیں کیا کچھ دکھاتی پھرتی ہیں‘ یہ مجھے بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔ پھر فرمایا کہ مردوں سے بات کرنی ہو تو ﴿فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَیَطْمَعَ الَّذِیْ فِیْ قَلْبِهٖ مَرَضٌ﴾ (الاحزاب:۳۳) ’’گفتگو میں لوچ پیدا نہ کرو‘ مبادا جس کے دل میں روگ ہے وہ کسی لالچ میں پڑ جائے‘‘۔ لیکن مخلوط تعلیم ہمیں اس کا اُلٹ سکھا رہی ہے۔ آج ہم کہتے ہیں کہ پرانا دور اب نہیں آ سکتا اور اس جدید دور میں اب ہم کیسے پردوں میں چھپیں۔ اس ضمن میں جان لیں کہ وہ جاہلیت قدیمہ کا دور تھا‘ جس میں دین کی شمع روشن ہوئی تو سج دھج دکھاتی ہوئی خواتین پردوں میں چھپ گئیں اور آج جاہلیت جدیدہ کا دور ہے جس میں آج ضرورت ہے کہ مسلمان عورت اتنی ہی ہمت دکھائے اور ’’پنہاں شوازیں عصر‘‘ ہو کر نئی نسل کی تربیت کرے اور اپنے دائرۂ کار جو اسے رب نے عطا کیا ہے اس پر دل و جان سے راضی رہے۔

❁❁❁

اصلی اور فرعی مسائل میں مخالفین کے ساتھ برتاؤ کرنے کے فقہی ضابطے (۶)

تالیف: ڈاکٹر احمد بن سعد الغامدیؒ (م ۱۴۳۴ھ)

ترجمہ: ڈاکٹر صہیب حسن

ضابطہ نمبر ۲۰:

قول اور فعل کے نتائج کا لحاظ رکھنا

اللہ تعالیٰ نے مصالح کے حصول اور مفاسد کی بیخ کنی کے لیے شریعتیں نازل کیں اور احکامات بھیجے' اس لیے ایک طالب علم اور داعی کے لیے ضروری ہے کہ بات کرنے سے یا کسی عمل کو کر گزرنے سے پہلے یہ خوب سوچ لے کہ اس قول یا فعل کے نتائج کیا ہوں گے۔ اگر اسے یقین ہو یا غالب گمان ہو کہ ایسا کرنے سے کوئی اچھی چیز برآمد ہوگی تو اس کے لیے یہ بات کرنا یا یہ فعل عمل میں لانا جائز ہوگا' لیکن اگر اسے نہ یقین ہو نہ گمانِ غالب ہو کہ ایسا کرنے سے بھلا ہوگا بلکہ اس کے برعکس کسی شر کے برآمد ہونے یا کسی خیر کے ضائع ہو جانے کا اندیشہ ہو تو پھر اسے نہ یہ بات کہنی چاہیے اور نہ ہی یہ فعل عمل میں لانا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿وَلَا تَسُبُّوا الَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ فَيَسُبُّوا اللَّهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ﴾

(الانعام:۱۰۸)

''اور گالی مت دو ان کو جن کی یہ لوگ اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر عبادت کرتے ہیں' کیونکہ پھر وہ براہِ جہل حد سے گزر کر اللہ تعالیٰ کی شان میں گستاخی کریں گے۔''

شیخ الاسلام اس قاعدے کو ''دینی امور میں موازنہ کرنے'' سے تعبیر کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''جب مصالح اور مفاسد اور نیکی اور بدی میں تعارض ہو' تو پھر جس کا پہلو غالب ہو اسے ترجیح دی جائے گی۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے نیکی کا حکم دینا اور بدی سے روکنا عموماً مصلحت کے حصول اور مفسدت کے دور کرنے کے لیے ہوتا ہے' لیکن اس میں بھی نتائج کو دیکھا جاتا ہے' اور اگر ایسا کرنے سے مصلحت ضائع ہو جانے کا اور مفسدت قائم رہنے کا اندیشہ ہو تو پھر ایسا کرنا بالکل ناجائز ہوگا' یعنی اگر مصلحت کے مقابلے میں مفسدت غالب آنے کا خطرہ ہو تو پھر ایسا کرنا سرے سے حرام ہوگا۔''

انہوں نے ''نیکی اور بدی دونوں میں تعارض (ٹکراؤ) یا دونوں کے ایک ساتھ جمع ہونے'' کے عنوان کے تحت لکھا ہے کہ:

''دو جگہوں پر بدی کو برداشت کیا جائے گا' اگر اس بدی سے اس سے بڑھ کر کسی برائی کو ہٹایا جا رہا ہو' یا اس بدی کے برداشت کرنے سے کوئی ایسا فائدہ حاصل ہو جو صرف اس بدی کے باقی رہنے سے ہی حاصل ہو سکتا ہے۔ اور اسی طرح نیکی کو ان دو صورتوں میں چھوڑا جائے گا' اگر اس کے باقی رہنے سے کسی بڑی نیکی سے انسان محروم ہو جائے' یا اس نیکی کی بنا پر کوئی ایسا نقصان لازم آئے جو اس نیکی کے مقابلے میں بہت بڑا ہو۔ اس قاعدے کو دینی امور میں موازنہ کرنے سے تعبیر کیا جائے گا۔''

پھر فرمایا:

''عاقل شخص وہ نہیں ہے جو شر کے مقابلے میں خیر کو جانتا ہو' بلکہ عاقل وہ ہے جو دو امورِ خیر میں سے بہتر کو اور دو امورِ بد میں سے بدتر کو جانتا ہو۔ ایک شاعر کہتا ہے: ؎

اِنَّ اللَّبِيْبَ اِذَا بَدَا مِن جِسْمِهٖ مَرَضَانِ مُخْتَلِفَانِ دَاوَى الْاَخْطَرَا

''عقل مند وہ ہے کہ اگر اس کے اپنے جسم میں دو بیماریاں ظاہر ہوں تو وہ ان میں سے زیادہ خطرناک بیماری کا علاج پہلے کرے گا۔''

پھر وہ ارشاد فرماتے ہیں:

''اگر دو حرام چیزیں ایسے جمع ہوں کہ ان میں سے بدتر سے بچنے کے لیے کم تر کا ارتکاب ضروری ہو تو پھر ایسی صورت میں کم تر برائی کا ارتکاب کرنا حرام نہ ہوگا۔''(۱)

صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے یہ حدیث وارد ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''اے عائشہ! اگر تمہاری قوم کے شرک پر زیادہ زمانہ نہ گزرا ہوتا تو میں کعبہ کو (یعنی کعبہ کے دروازہ کو) گرا کر زمین کے برابر کر دیتا اور اس کے دو دروازے بنا دیتا' ایک مشرقی اور دوسرا مغربی اور کعبہ کی جسامت میں حجر (اسماعیل علیہ السلام) کے چھ ہاتھ برابر اضافہ کر دیتا' کیونکہ قریش نے کعبہ کو دوبارہ بناتے وقت اتنا حصہ چھوڑ دیا تھا۔''(۲)

امام بخاری حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ روایت درج کرتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جب اپنا آخری حج ادا کر رہے تھے تو انہیں منیٰ کے قیام کے دوران کچھ لوگوں کی یہ بات پہنچی کہ اگر عمر فوت ہو جائیں تو میں فلاں شخص کی بیعت کروں گا' کیونکہ اللہ کی قسم حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بیعت اچانک ہو گئی تھی اور پوری بھی ہو گئی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ غصے میں آ گئے اور کہنے لگے: ''میں ان شاء اللہ آج شام لوگوں سے خطاب کروں گا اور ان لوگوں سے محتاط رہنے کے لیے کہوں گا جو لوگوں کے حقوق غصب کرنا چاہتے ہیں''۔ یہ سن کر عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے اور کہنے لگے: یا امیر المؤمنین! ایسا نہ کیجیے' کیونکہ موسم حج میں ہر قسم کے لوگ جمع رہتے ہیں' انتظار کیجیے یہاں تک کہ آپ مدینہ منورہ واپس پہنچ جائیں۔ مدینہ ہجرت اور سنت کا گھر ہے' وہاں آپ شرفاء اور سمجھ دار لوگوں کو جمع کر کے اپنے دل کی بات اطمینان کے ساتھ کہہ سکتے ہیں۔ اہل علم آپ کی بات کو خوب سمجھیں گے اور اسے درست معنوں میں لیں گے۔ تو حضرت عمرؓ نے کہا: ''اللہ کی قسم! اگر ایسی بات ہے تو میں ان شاء اللہ مدینہ پہنچتے ہی یہ کام کر گزروں گا۔''(۳)

تو یہ بات واضح ہو گئی کہ ایک طالب علم کو ہمیشہ نتائج پر نظر رکھنی چاہیے' یعنی اگر ایسا کروں گا تو اس کے نتیجے میں کیا ردعمل ہو سکتا ہے۔ اور یہ بات ہر انسان کے بس کی نہیں' اس کی توفیق اسی شخص کو ہوتی ہے جو گہرا علم رکھتا ہو' اس کا دائرۂ معلومات وسیع ہو' نئے نئے معاملات میں علماء کے اقوال اور ان کے موقف کو بخوبی جانتا ہو' اور پھر ان میں سے بہترین اور درست ترین کو خوب پہچانتا ہو' اور یوں اس کے لیے صحیح بات کہنے کی توفیق عطا ہو۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿وَمَا يُلَقّٰىهَآ اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا ۚ وَمَا يُلَقّٰىهَآ اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ ۝۳۵﴾ (فصّلت)

''اور یہ بات انہی کو نصیب ہوتی ہے جو صبر کریں' اور اسے وہی پا سکتا ہے جو بہت بڑے نصیب والا ہو۔''

حواشی

(۱) الفتاویٰ' ۲۰:۵۳'۶۱۔

(۲) صحیح البخاری (۱۵۰۹) وصحیح مسلم (۴۰۱) الفاظ صحیح مسلم کے ہیں۔

(۳) صحیح البخاری (٦٤٤٢)۔

❁

ضابطہ نمبر ۲۱:

اس بات کا اعتقاد رکھنا کہ غلط اجتہاد پر مجتہد کی غلطی معاف کی جاتی ہے

مسلمان اس بات کے محتاج ہیں کہ اپنے رب کی کتاب اور اپنے نبی ﷺ کی سنت کو سمجھ سکیں اور اسی طرح اس بات کے بھی محتاج ہیں کہ اعتقادی اور عملی مسائل میں دین کا بھی ادراک کر سکیں۔ اُمت کا ہر مسلمان یہ کام خود نہیں کر سکتا اور نہ ہی اسے اس بات کا مکلّف قرار دیا گیا ہے' اس لیے مسلمانوں ہی میں سے ایک جماعت کا اس کام کے لیے فارغ ہونا انتہائی ضروری ہے اور یہی لوگ اس بات کے مکلّف ہیں کہ شرعی نصوص کو پوری طرح سمجھ کر ان احکامات کو پہچان سکیں۔ اور جب ایسا ہی کوئی عالم ان امور میں اجتہاد کرتا ہے اور اپنے اجتہاد میں پوری پوری محنت صرف کرتا ہے تو یا تو وہ حق بات کا ادراک کر لیتا ہے اور یا پھر غلطی کر بیٹھتا ہے۔

اگر وہ اپنے اجتہاد میں حق و راستی کو پا گیا تو دوہرے اجر کا مستحق ہو گا اور اگر غلطی کر بیٹھا تو پھر بھی وہ ایک اجر کا مستحق ہو گا۔ اس پر کوئی وبال نہ ہو گا۔ اپنے اجتہاد میں غلطی کر بیٹھنے کے بہت سے اسباب ہو سکتے ہیں جن کی وجہ سے اللہ عزوجل اسے معاف فرمائیں گے۔(۱)

یہی مذہب ہے اہل سنّت والجماعت کا جس کی وضاحت آگے آ رہی ہے۔

متکلّمین میں سے معتزلہ' اشاعرہ اور چند اور گروہ بھی' فروعی مسائل میں غلطی کرنے پر' کہ جسے وہ بعض اوقات ظنّی امور سے تعبیر کرتے ہیں' اس رائے میں اہل سنت والجماعت کے ساتھ ہیں' لیکن اصولی مسائل میں کہ جسے وہ قطعی امور یا عقائد کہتے ہیں' وہ ان کے مخالف ہیں۔ ہم یہاں اہلِ سُنّت والجماعت کے مذہب کی تائید میں قرآن وسنت کے دلائل پیش کریں گے اور اس ضمن میں اہلِ علم کی آراء بھی نقل کریں گے۔ اللہ عزوجل ارشاد فرماتے ہیں:

﴿لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ؕ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ ؕ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِيْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ ۚ وَاعْفُ عَنَّا ۟ وَاغْفِرْ لَنَا ۟ وَارْحَمْنَا ۟ اَنْتَ مَوْلٰىنَا فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۸۶﴾﴾

(البقرة)

''اللہ تعالیٰ کسی جان کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا۔ جو نیکی کرے وہ اس کے لیے اور جو برائی کرے اس کا وبال اسی پر ہے۔ اے ہمارے ربّ! اگر ہم بھول جائیں یا غلطی کریں تو ہمیں نہ پکڑنا۔ اے ہمارے رب! ہم پر وہ بوجھ نہ ڈال جو تو نے ہم سے پہلوں پر ڈالے۔ اے ہمارے رب! ہم پر وہ بوجھ نہ ڈال جس کی ہم میں طاقت نہ ہو اور ہم سے درگزر فرما اور ہمیں بخش دے اور ہم پر رحم کر! تو ہی ہمارا مالک ہے، پس ہمیں کفار پر غلبہ عطا فرما۔''

یہ آیت اس قولِ ربانی کے بعد نازل ہوئی:

﴿لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ ؕ فَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۲۸۴﴾﴾ (البقرة)

''آسمانوں اور زمین کی ہر چیز اللہ ہی کی ملکیت ہے۔ تمہارے دلوں میں جو کچھ ہے اسے تم ظاہر کرو یا چھپاؤ، اللہ تعالیٰ اس کا حساب تم سے لے گا۔ پھر جسے چاہے بخشے اور جسے چاہے عذاب دے۔ اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔''

امام مسلم حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا کہ جب یہ آیت اتری:

﴿وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ ؕ﴾

''جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے چاہے تم اسے ظاہر کرو یا چھپاؤ، اللہ تمہارا محاسبہ کرے گا۔''

تو انہیں ایسی فکر لاحق ہوئی جو پہلے کبھی نہ لاحق ہوئی تھی، تو نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''کہو کہ ہم نے سنا، ہم نے اطاعت کی اور ہم جھک گئے۔''

(حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے) کہا کہ پھر اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں ایمان جاگزیں کر دیا اور پھر یہ آیات نازل کیں:

﴿لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ؕ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ ؕ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِيْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا ۚ﴾

اور اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ''میں نے ایسا کر دیا'' (یعنی ان کی دعا قبول کی)

اور پھر جب اہلِ ایمان نے مزید دعا کی:

﴿رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا ۚ﴾

تو پھر کہا: ''میں نے ایسا کر دیا۔'' (۲)

امام ابن تیمیہؒ ارشاد فرماتے ہیں:

''اللہ تعالیٰ کا اہل ایمان کی دعا کے بعد یہ کہنا کہ ''میں نے ایسا کر دیا'' یہاں مسئلہ چاہے قطعی ہو یا ظنّی، اس میں غلطی ہو جانے میں فرق روا نہیں رکھا، اور یہ بات معلوم ہے کہ ظنی اسے کہا جاتا ہے کہ جہاں غلطی ہونے کے بارے میں وثوق سے نہ کہا جا سکے۔ اسی لیے اہلِ سنّت کا یہ مذہب ہے کہ اگر کوئی یوں کہے کہ کسی قطعی یا ظنی مسئلہ میں غلطی کرنے والا گنہگار ہے تو وہ کتاب، سنت اور قدیمی اجماع کا مخالف ہے'' .....

''اور انہوں نے یہ بھی کہا کہ ''کسی مسئلہ کا قطعی ہونا یا ظنی ہونا، وہ معتقد کے حال کے مطابق ایک اضافی آمر ہے، نہ کہ قول کا اپنا ذاتی وصف''(۳)

اور امام ابن تیمیہؒ غلطی کرنے والے مجتہد کے بارے میں ارشاد فرماتے ہیں:

''ہوسکتا ہے وہ شرع میں تاویل کرنے والا ہو تو پھر اسے اجتہاد میں غلطی کرنے کے اعتبار سے معاف کیا جائے گا، بلکہ اجتہاد کرنے پر ثواب بھی دیا جائے گا، البتہ اس امر میں اس کی پیروی ناجائز ہوگی۔''(۴)

شیخ الاسلام نے امام رازی پر تنقید کرتے ہوئے اور ان کی طرف سے معذرت کرتے ہوئے، جیسے ضابطہ نمبر چھ میں گزر چکا ہے، ارشاد فرمایا:

''جس انسان سے غلطی واقع ہو اور وہ اس سے آگے جانے کی قدرت ہی نہ رکھتا ہو (یعنی اس کی سمجھ سے باہر ہو) اور پھر وہ اس کے ازالہ پر بھی نہ قادر ہو، تو پھر اس کے لیے یہ وہ عذر ہوگا کہ چونکہ اس نے پوری طرح اجتہاد کیا ہے تو اللہ اسے عذاب نہ دے۔''(۵)

اور پھر ارشاد فرمایا:

''کئی عابد، عالم بلکہ حاکم اجتہاد کرنے کی بنا پر اپنے فعل میں معذور سمجھے جائیں گے، چونکہ اصل مقصود یہ ہے کہ وہ صحیح دلیل کو سمجھیں، اگر وہ اسے چھوڑتے بھی ہیں تو اپنے اجتہاد کی بنا پر معذور شمار ہوں گے، بلکہ ہوسکتا ہے کہ وہ مرتبۂ صدیقیت پر فائز ہوں، کیونکہ صدیق کی شرائط میں سے یہ نہیں ہے کہ اس کا قول ہمیشہ صحیح ہو اور اس کا عمل ہمیشہ سنت ہو، کیونکہ اگر ایسا ہو تو وہ اللہ کے رسول ﷺ جیسا ہوگا، اور یہ باب بہت وسیع ہے (یعنی اس بارے میں بہت کچھ کہا جاسکتا ہے)۔''(۶)

میلاد منانے کی بدعت کے بارے میں کہتے ہیں:

''مولد نبوی کو بڑا جاننا اور اس کو منانا، جیسا کہ کچھ لوگ کرتے ہیں، باعث اجر بھی ہوسکتا ہے اگر کرنے والے کا قصد اچھا ہو اور وہ نبی ﷺ کی تعظیم کے ارادے سے ایسا کر رہا ہو۔ جیسا کہ ہم نے پہلے بھی لکھا ہے کہ بعض دفعہ ایک چیز جو راست یافتہ مؤمن کے لیے تو اچھی نہ شمار ہوگی لیکن ایک عام آدمی سے اچھی سمجھی جائے گی۔''(۷)

اور ابن القیمؒ کہتے ہیں:

''جو شخص شرع کا اور حالاتِ حاضرہ کا علم رکھتا ہے، بخوبی جانتا ہے کہ ایک ایسا شخص جو خدمتِ اسلام میں معروف و مشہور ہو اور اپنے نیک کاموں کی وجہ سے پہچانا جاتا ہو، وہ اگر پھسل بھی جائے تو اسے معذور سمجھا جائے گا، بلکہ اپنے اجتہاد کی بنا پر اسے اجر کا مستحق بھی گردانا جائے گا، لیکن اس معاملے میں اس کی پیروی نہیں کی جائے گی اور یہ جائز نہیں ہوگا کہ لوگوں کے دلوں سے اس کے رتبے، اس کی شان اور اس کی امامت کو گھٹا دیا جائے۔'' (۸)

شاطبیؒ کہتے ہیں:

''اگر عالم سے بھول ہو جائے تو نہ اس پر ایک لحاظ سے بھروسہ کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی اس کی تقلید کی جاسکتی ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس پر کوتاہی کا الزام نہ لگایا جائے، نہ ہی اسے برا بھلا کہا جائے، نہ ہی اس کی بے قدری کی جائے اور نہ ہی یہ اعتقاد رکھا جائے کہ وہ مخالفت پر آمادہ ہے۔ ایسا کرنا دینی لحاظ سے اس کے رتبے کو دیکھتے ہوئے مناسب نہیں ہے۔''(۹)

ابن تیمیہؒ کہتے ہیں:

''اگر ایک عالم اپنے فتاویٰ کی کثرت کی وجہ سے مشہور ہو اور ایک سو مسائل میں اس سے غلطی سرزد ہو جائے تو اسے عیب نہیں کہا جائے گا۔''(۱۰)

سعید بن المسیبؒ کہتے ہیں:

''آدمی چاہے شریف ہو، عالم ہو، صاحبِ سلطان ہو، اس میں کوئی نہ کوئی عیب تو پایا جائے گا، لیکن بعض لوگوں کے عیوب ذکر نہیں کیے جاتے۔ جس شخص کی فضیلت اس کی کوتاہیوں کے مقابلے میں زیادہ ہو تو اس فضیلت کی بنا پر اس کی کوتاہیوں سے چشم پوشی برتی جائے گی۔''(۱۱)

ابن حجرؒ کہتے ہیں:

''علماء کا کہنا ہے، ہر تاویل کرنے والا اپنی تاویل کی بنا پر معذور قرار دیا جائے گا۔ اگر اس کی تاویل عربی زبان کے لحاظ سے قابل قبول ہو اور عملی اعتبار سے اس کی توجیہہ کی جاسکتی ہو تو وہ گنہگار نہ ہوگا۔''(۱۲)

غلطی کرنے والے مجتہد کے بارے میں اہل سنت والجماعت کا یہی مذہب ہے۔ لیکن متکلمین میں سے معتزلہ اور اشاعرہ اس بات میں مخالفت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اصول یعنی عقائد میں مجتہد اگر اپنے اجتہاد میں درست پایا جائے تو وہ اجر کا مستحق ہوگا، لیکن اگر غلطی کر بیٹھے تو گنہگار ہوگا، کیونکہ غلطی کے ساتھ گناہ کا ہونا ان کے نزدیک لازمی ہے۔

ابن تیمیہؒ نے اپنے ایک مستقل مضمون میں ان کے اقوال کا خلاصہ بیان کرتے ہوئے کہا ہے کہ:

''لوگوں کا اس مسئلہ میں اختلاف ہوا ہے کہ مجتہدین کو اصولی و فروعی مسائل میں غلطی کر بیٹھنے پر گناہ ہوگا یا نہیں۔ ہم اس ضمن میں چند جامع اور مفید اصول بیان کریں گے:

پہلی بنیاد: سوال یہ ہے کہ کیا ہر شخص کے لیے یہ ممکن ہے کہ وہ ہر نزاعی مسئلہ میں اپنے اجتہاد کی بنا پر حق کو پہچان لے؟ اگر اسے حق معلوم نہ ہو، پھر وہ اجتہاد کرے، اپنی تمام طاقت صرف کر ڈالے پھر بھی حق تک نہ پہنچ پائے اور پھر یوں کہے کہ جو میں اعتقاد رکھتا ہوں وہی نفس الامر میں حق ہے، حالانکہ وہ حقیقی طور پر درست نہ تھا، تو آیا ایسے شخص کو سزا دی جائے گی؟ یہ ہے اصل مسئلہ کہ جس کے بارے میں اہل علم کے تین قول ہیں اور ہر قول ایک نہ ایک گروہ سے منسوب ہے۔

پہلا قول ان لوگوں کا ہے جو یہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہر مسئلہ میں حق بات پر ایک دلیل رکھ دی ہے جس سے حق کی پہچان ہو جاتی ہے، اور اگر مجتہد پوری صلاحیت کے ساتھ اجتہاد کرے تو وہ اس حق کو پہچان لیتا ہے۔ اور جو شخص بھی کسی بنیادی یا فروعی مسئلہ

میں حق کو پہچان نہیں سکا ہے تو وہ عجز کی بنا پر نہیں بلکہ اپنی کوتاہی کی بنا پر اس حال کو پہنچا ہے۔

اس قول کے قائل قدریہ (تقدیر کے منکر)' معتزلہ اور کچھ دوسرے متکلمین ہیں۔ اور ان لوگوں نے یہ بھی کہا ہے کہ علمی مسائل پر قطعی دلائل رکھے گئے ہیں جس سے ان کی پہچان ہوتی ہے۔ اور اگر مجتہد ان کو نہ پا سکے تو اس نے حق کو پہچاننے میں اپنی پوری طاقت صرف نہیں کی ہے' اس لیے وہ گنہگار ہوگا۔

باقی رہے عملی مسائل تو اس میں بھی دو رائے ہیں:

پہلی تو وہی ہے جو علمی مسائل کے ضمن میں بیان ہوئی ہے کہ ہر مسئلہ پر ایک قطعی دلیل رکھی گئی ہے' اور جو شخص اس کی مخالفت کرے گا وہ گنہگار ہوگا۔ یہ لوگ صاف صاف کہتے ہیں کہ ہر بنیادی اور فرعی مسئلہ میں ایک ہی شخص درست ہوسکتا ہے اور اس درست شخص کے علاوہ ہر دوسرا گنہگار ہے' کیونکہ اس سے غلطی کا ارتکاب ہوا ہے اور ان لوگوں کے نزدیک غلطی کرنے پر گناہ کا ہونا لازم ہے۔

یہ قول بشر المریسی اور بغداد کے اکثر معتزلہ کا ہے۔

دوسری رائے یہ ہے کہ عملی مسائل میں اگر کوئی قطعی دلیل پائی جائے اور پھر کوئی اس کی مخالفت کرے تو وہ غلطی پر ہے اور گنہگار ہے۔ بالکل ایسے ہی جیسے علمی مسائل کے بارے میں کہا گیا اور اگر ان پر کوئی قطعی دلیل نہ ہو تو اللہ تعالیٰ نے اس کے بارے میں کوئی حکم سرے سے نہیں دیا بلکہ ہر مجتہد اپنے اجتہاد کے مطابق جو بھی فیصلہ کرے وہی اللہ تعالیٰ کا حکم شمار ہوگا۔

یہ رائے رکھنے والے پہلے والوں کے ساتھ اس بات میں تو موافقت رکھتے ہیں کہ غلطی اور گناہ لازم وملزوم ہیں اور یہ کہ ہر غلطی کرنے والا گنہگار ہے' لیکن اجتہادی مسائل میں ان سے اختلاف رکھتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ان امور میں کوئی قطعی دلیل نہیں ہے اور ظنی دلیل کوئی دلیل نہیں ہے' اسے تو صرف میلانِ نفس سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ گویا ظنی اعتقاد ارادے کی طرح ہے۔ ان کی رائے میں ایسے امور میں اجتہاد کے ذریعہ کسی حکم تک پہنچنے کا مطالبہ ہی نہیں کیا گیا۔

یہ قول ابوالہذیل العلاف اور اس کے پیروکاروں میں سے الجبائی اور اس کے بیٹے کا ہے۔ اشعری کے بھی دو اقوال میں سے مشہور یہی قول ہے اور اسی قول کو قاضی باقلانی' ابوحامد غزالی اور ابوبکر بن العربی نے اختیار کیا ہے۔ ہم نے اس بارے میں کئی جگہوں پر مفصل کلام کیا ہے۔

اس قول کی مخالفت کرنے والوں میں اشاعرہ میں سے ابواسحٰق الفرائینی اور دوسرے حضرات ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اس قول کا آغاز سفسطہ اور انتہاء زندقہ ہے (یعنی شروع میں بے معنی کلام ہے اور آخر میں کفریہ بات ہے) یعنی یوں کہنا کہ عملی مسائل میں اجتہاد کرنے والا ہر مجتہد ظاہری اور باطنی دونوں لحاظ سے درست ہے۔ ان کے نزدیک ایک مجتہد غلطی پر ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ ہوسکتا ہے کہ بعض باتیں اس کی نظر سے اوجھل رہی ہوں' اور ایسی باتیں اس کے حق میں یا اس جیسے دوسرے لوگوں کے حق میں اللہ کا حکم شمار نہیں ہوتیں۔ صرف وہ قطعی مسائل میں غلطی کرنے کی بنا پر گنہگار ہوگا۔

اس مسئلہ میں دوسرا قول یہ ہے کہ مجتہد اپنے اجتہاد کے نتیجے میں حق کو پہچان بھی سکتا ہے اور اس سے عاجز بھی رہ سکتا ہے' لیکن اگر عاجز رہے تو یہ اللہ تعالیٰ کی مشیت ہے کہ اسے سزا دے یا نہ دے' کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنی مشیت کی بنا پر کسی بھی شخص کو بغیر سبب کے بھی عذاب دینا چاہیں تو عذاب دے سکتے ہیں اور معاف کرنا چاہیں تو معاف کر سکتے ہیں۔ یہ قول جَہمیہ اور اشاعرہ کا ہے اور اسی طرح بہت سے فقہاء اور ائمہ اربعہ کے پیروکاران اور کئی دوسرے حضرات کا ہے۔''(۱۳)

اور پھر انہوں نے جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا' اہل سنت والجماعت کے مذہب کا ذکر کیا ہے۔ تو یہ ہیں متکلمین کے اقوال کہ جن سے انہوں نے مذہب سلف کی مخالفت کی ہے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ راجح مذہب اہل سنت والجماعت کا ہی ہے جو قرآن وسنت کے دلائل پر قائم ہے کہ جس کے مطابق غلطی کرنے والے مجتہد کو بھی معذور قرار دیا گیا ہے بلکہ اسے اجتہاد کی بنا پر ایک درجہ اجر کا مستحق بھی قرار دیا گیا ہے اور درست رائے تک نہ پہنچنے میں اسے قابلِ معافی گردانا گیا ہے۔ اور یہی رائے صائب رائے ہے کہ جس کی بنا پر امت میں اتحاد پیدا ہوسکتا ہے اور لوگوں کے دل اکٹھے ہو سکتے ہیں۔ اس لیے ان لوگوں کے لیے جو اللہ کی طرف بلاتے ہیں' ضروری ہے کہ وہ اس ربانی منہج کی پیروی کریں جو فطرت کے قریب ہے اور اُمت کو جوڑ سکتا ہے۔

حواشی

(۱) ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے ان اسباب کو اپنی قابلِ فخر کتاب ''رفع الملام عن الائمة الاعلام'' میں جمع کر دیا ہے اور اس کتاب میں ائمہ اربعہ ابوحنیفہ' مالک' شافعی اور احمد بن حنبل رحمہم اللہ کا دفاع کیا ہے۔ اللہ جناتِ نعیم میں ان کے رتبوں کو بلند فرمائے۔

(۲) مسلم' حدیث نمبر ۱۲۶۔

(۳) منهاج السنة ۵:۹۱۔

(۴) اقتضاء الصراط المستقیم، ص ۲۶۸۔

(۵) الفتاویٰ ۵: ۵۶۱۔۵۶۳۔

(۶) ایضًا، ص ۲۸۲ اور ص ۲۹۰، ۲۹۴۔

(۷) ایضًا، ص ۲۹۷۔ اس کلام کی وضاحت کے طور پر عرض کرتا ہوں کہ بدعت کے دو پہلو ہیں:

''اول: اس پر کس چیز نے ابھارا ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ نبی ﷺ کی محبت ہی اس کا سبب ہے اور یہ دل کا عمل ہے کہ جسے اچھے ارادے اور تعظیم نبیؐ سے تعبیر کیا گیا ہے اور اسی کی طرف ابن تیمیہ نے اشارہ کیا ہے اور اسی پر اجر بھی ملے گا۔ دوسرا پہلو عمل کا ہے، اس پر اجر کا مستحق نہ ہوگا، کیونکہ دین میں نئی بات کا اضافہ کیا ہے۔ حدیث میں ارشاد ہوا: ''جو شخص ہمارے اس دین میں ایسی کوئی بات پیدا کرتا ہے جو اس میں شامل نہ تھی تو وہ رد کر دی جائے گی۔'' (مسلم، حدیث نمبر ۴۵۸۹)

(۸) اعلام الموقعین ۳:۳۵۹۔

(۹) الموافقات ۴:۱۷۱۔

(۱۰) االفتاویٰ ۶:۲۵۸۔

(۱۱) أدب الدنیا والدین، ص ۷۰۔

(۱۲) فتح الباری ۱۲:۳۷۶۔

(۱۳) الفتاویٰ ۱۹:۲۰۳۔

ضابطہ نمبر ۲۲:

اجتہاد میں غلطی دوستی کو ختم کرنے یا کمزور کرنے کا باعث نہیں ہوتی

اسلام میں داخل ہونا ایسے ہے جیسے اہل ایمان کے ساتھ ایک شرعی معاہدہ کرنا جسے اللہ تعالیٰ نے اخوت کا نام دیا ہے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے چاہے وہ گنہگار اور نافرمان کیوں نہ ہو۔ گناہ کی وجہ سے یہ تعلق منقطع نہیں ہو جاتا، چاہے اس کا مرتکب بدعتی ہی کیوں نہ ہو، الا یہ کہ اس کی بدعت کفر صریح تک پہنچ جائے جو ملّت سے باہر کر دے۔ ایمان کا یہ تعلق بہت ہی عظیم تعلق ہے اور ایک مسلمان کو اسے نیچا نہیں سمجھنا چاہیے۔ اللہ

تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ فَأَصْلِحُوا بَيْنَ أَخَوَيْكُمْ ۚ وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ ۝١٠﴾ (الحجرات)

''بے شک اہلِ ایمان بھائی بھائی ہیں تو اپنے بھائیوں میں صلح کرواؤ، اور اللہ سے ڈرو تا کہ تم پر رحمت ہو سکے۔''

اور نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''تم میں سے کوئی شخص مؤمن نہ ہوگا جب تک کہ وہ اپنے بھائی کے لیے وہی کچھ نہ پسند کرے جو اپنے لیے پسند کرتا ہے۔''(۱)

ابن الصلاح لکھتے ہیں:

''تم میں سے کسی شخص کا ایمان اس وقت تک مکمل نہیں ہوتا جب تک وہ اسلام کے تقاضے سے اس کے لیے بھی وہی کچھ نہ پسند کرے جو اپنے لیے کرتا ہے، یعنی اسے بھی وہ کچھ حاصل ہو جو اسے حاصل ہے، لیکن اس طرح کہ اس کے ساتھ کوئی مقابلہ نہ ہو، اور اسے بھی وہ نعمت ملے جو اسے ملی ہوئی ہے لیکن اسے خود گھاٹا نہ ہو۔ ایک قلبِ سلیم کے لیے یہ بات آسان ہے، لیکن کینہ پرور کے لیے بڑی مشکل ہے۔ اللہ ہمیں ایسی خصلت سے دور رکھے۔''(۲)

کِرمانی کہتے ہیں:

''اور ایمان کا تقاضا یہ بھی ہے کہ جو بری بات اپنے لیے ناپسند کرتا ہے وہ اپنے بھائی کے لیے بھی ناپسند رکھے، گو اس بات کا ذکر نہیں کیا لیکن ایک چیز کو پسند کرنے کا مطلب یہی ہے کہ اس کی الٹ چیز ناپسند ہو، اس لیے پہلی بات کے ذکر پر اکتفا کیا گیا۔''(۳)

تو جو شخص اپنے بھائی کے لیے اچھی بات پسند کرے اور بری بات ناپسند کرے تو ایسا شخص اس کے حق میں کوئی برا کام نہیں کرتا بلکہ اس سے محبت رکھتا ہے۔ اس کی اچھی باتوں کی تعریف کرتا ہے اور یہ ایمان کا تقاضا ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ ضرورت کے وقت نہ اس پر تنقید کرے اور نہ نصیحت کرے۔

اخوت اور بھائی چارے کی یہ شرط نہیں ہے کہ وہ کسی گناہ یا بدعت میں ملوث نہ ہو، البتہ اس کے گناہ یا بدعت کے برابر اس کی محبت میں کمی آ جائے گی، لیکن اخوت اسلام باقی رہے گی

جواس کی اطاعت میں کوتاہی یا معصیت میں مبتلا ہونے کی بنا پر منقطع نہ ہوگی۔

اجتہاد میں غلطی کی بنا پر دوستی میں کمی یا کمزوری نہیں آنی چاہیے' کیونکہ اجتہاد میں غلطی معاف کی گئی ہے' جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے خود ہمیں یہ کہنا سکھلایا ہے:

﴿رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِيْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا﴾

''اے ہمارے ربّ! اگر ہم بھول جائیں یا غلطی کر بیٹھیں تو ہمیں مت پکڑنا۔''

اور پھر اللہ تعالیٰ نے کہا: ''میں نے ایسا ہی کیا۔''

اللہ عزوجل تو خطا کرنے والے کا مؤاخذہ نہیں کرتے بلکہ حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کی روایت کے مطابق اسے اس کے اجتہاد پر اجر سے نوازتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے سنا:

> ''جب حاکم ایک فیصلہ کرتا ہے اور اس بارے میں اجتہاد کرتا ہے اور اپنے اجتہاد میں صحیح رائے تک پہنچتا ہے تو اسے دو اجر ملتے ہیں' لیکن اگر اپنے اجتہاد میں غلطی بھی کر بیٹھتا ہے تو اسے ایک اجر ملتا ہے۔''(۴)

اب ہمارے لیے یہ کیسے مناسب ہوگا کہ ہم اسے اس حق سے محروم کر دیں جو ہم پر واجب ہوتا ہے' یعنی اس سے دوستی رکھنا یا اس حق میں کوتاہی کریں۔ ابوالمظفر الشمعانی رحمہ اللہ ارشاد فرماتے ہیں:

> ''اختلاف کی دوسری قسم وہ ہے جو محبت کو زائل نہیں کرتی' نہ ہی آپس میں دوری پیدا کرتی ہے' نہ ہی دوسرے سے براءت پر آمادہ کرتی ہے اور نہ ہی اسلامی اخوت کو ختم کرتی ہے' یعنی نئے نئے معاملات میں اختلاف کا واقع ہونا کہ جہاں مسئلہ فروعی ہو' کوئی نقص موجود نہ ہو' دلائل پوشیدہ ہوں اور پھر کسی رائے تک پہنچنے کے لیے اجتہاد کی ضرورت ہو۔''(۵)

اجتہاد میں خطا کے بارے میں ہمارے یہ دو موقف ہیں:

(۱) ہم مجتہد کی غلطی کی پیروی نہ کریں' بلکہ اسے صحیح بات بتائیں۔

(۲) ہم اس کے حقوق میں کوتاہی نہ کریں' اور وہ یہ ہیں کہ ہم اس سے دوستی رکھیں' محبت رکھیں اور اس کی مدد کرتے رہیں۔

اپنے ایک مسلمان بھائی کہ جس نے اپنے اجتہاد میں غلطی کی ہے' کے ساتھ ہمارا شرعی

طور پر یہ موقف ہونا چاہیے' اور اگر ہم اس قاعدے پر عمل کرتے تو امت میں وہ بے شمار جھگڑے نہ ہوتے کہ جو دشمنی کی حد تک لے جا کر ایک دوسرے کے حقوق سلب کرنے پر آمادہ کرتے رہے۔

حواشی

(۱) البخاری' حدیث نمبر ۱۸۷۔
(۲) صحیح مسلم پر النووی کی شرح' ۱۷:۲۔
(۳) فتح الباری ۸۵:۱۔
(۴) البخاری (۶۸۰۵) و مسلم (۳۲۴۰)۔
(۵) قواطع الأدلّة ۳۰۸:۲۔

❁

ضابطہ نمبر ۲۳:

تاویل کی غلطی ایک مسلمان کو دین سے خارج نہیں کرتی

قرآن وسنت کی نصوص سمجھنے کے لیے اسلامی تاریخ کے مختلف ادوار میں علماء اجتہاد کے محتاج رہے ہیں اور اس بنا پر ان میں اختلاف بھی پیدا ہوتا رہا ہے' اور پھر ہر ایک اجتہاد کو قبول کرنے کے ضمن میں گروہ بندیاں بھی پیدا ہوئیں۔ ہر مجتہد نے اپنے درست ہونے اور مخالف کے غلطی پر ہونے کا دعویٰ کیا' بلکہ مخالفین پر بدعتی' فاسق اور کافر ہونے کی حد تک الزام عائد کیے' اور اس طرح یہ سلسلہ نسل در نسل چلتا رہا' یہاں تک کہ ہمارے زمانے تک آ پہنچا' اس زمانے کے لوگوں نے بھی اسے آڑے ہاتھوں لیا اور دوسرے زیادہ ضروری کاموں کو چھوڑ کر انہی اختلافات کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا۔

مخالفین پر یہ الزام تراشی حد سے بڑھتی رہی اور دعوت کے میدان میں کام کرنے والوں کی اکثریت نے اس موضوع پر بہت کم سوچ بچار کیا جس کی وجہ سے دائرہ اختلاف بڑھتا گیا اور امت کی صفوں میں انتشار پیدا ہوتا گیا۔ چنانچہ اب یہ بات انتہائی ضروری ہوگئی ہے کہ اس قسم کے الزامات اور احکامات پر ٹھنڈے دل سے سوچا جائے۔ یہاں ہمیں مخالفین پر کفریہ حکم لگانے کے مسئلہ پر خاص طور سے غور کرنا ہے' کیونکہ ایک مخالف پر سب سے زیادہ سنگین الزام یہی ہے۔

پچھلے تمام زمانوں میں جید علماء نے خاص طور پر یہ تنبیہ کی ہے کہ کسی مخالف پر اجتہادی امر میں کفر کا حکم لگانے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ دین سے خارج ہوگیا ہے' بلکہ اس سے مراد عملی

کفر ہے نہ کہ اعتقادی کفر۔

اس لیے ہم یہ کہیں گے کہ اجتہادی امور میں مخالفت کرنے والا مسلمان ہی رہتا ہے' چاہے کتنی بڑی غلطی کیوں نہ ہو۔ اسے مسلمانوں کے حقوق حاصل رہیں گے اس شرط کے ساتھ کہ وہ اسلام کے بنیادی اصولوں کا قائل رہا ہے اور مسلمانوں کی جماعت سے جدا نہیں ہوا ہے۔

یہاں اس ضمن میں ہم علماء کے چند اقوال پیش کریں گے:

(۱) ابن تیمیہؒ کہتے ہیں کہ مسئلہ تکفیر کے دو پہلو ہیں: پہلا یہ کہ اس کے ظاہری کفر کو ثابت کیا جائے اور دوسرا یہ کہ اس کے باطنی کفر کو ثابت کیا جائے۔ پھر لکھتے ہیں:

''ہم اس شبہ کو زائل کرنے کے لیے مزید وضاحت کرتے ہیں' کیونکہ اکثر فقہاء یہ خیال رکھتے ہیں کہ جسے کافر کہہ دیا گیا تو اس پر مرتد کے احکام جاری کرنا ضروری ہو گئے۔ چنانچہ نہ وہ وارث ہوسکتا ہے اور نہ کوئی اس کا وارث بن سکتا ہے' نہ ہی وہ مسلمانوں میں نکاح کرسکتا ہے' یہاں تک کہ اگر کسی نے بدعت کی تاویل کی ہو تو اسے بھی کافر سمجھتے ہیں اور اس پر بھی کفر کے احکام جاری کرنے کے قائل ہیں' حالانکہ ایسا نہیں ہے۔''(۱)

جب ان سے ایسے شخص کے بارے میں سوال کیا گیا جو رافضیوں پر یہود اور نصاریٰ کو افضل قرار دیتا ہے تو انہوں نے کہا:

''الحمدللہ' ہر وہ شخص جو محمد ﷺ پر ایمان لاتا ہے وہ اس سے بہتر ہے جو ان پر ایمان نہیں لاتا' چاہے ایسے مسلمان میں خارجیوں' شیعہ' مُرجئہ اور تقدیر کے منکر لوگوں کی سی بدعت ہی کیوں نہ پائی جاتی ہو' وہ اس لیے کہ یہود اور نصاریٰ کا کافر ہونا' دینِ اسلام میں اٹل ہے۔ اس کے مقابلے میں بدعتی شخص اپنے آپ کو نبی ﷺ کا مخالف نہیں بلکہ ہمنوا سمجھتا ہے' اگر اسے کافر بھی کہا جائے تو اس کا کفر اس شخص کی مانند نہیں ہے جس نے نبی کریم ﷺ کو جھٹلایا۔''(۲)

اور پھر ارشاد فرمایا:

''مقصود کلام یہ ہے کہ منافق کو چھوڑ کر کسی بھی شخص کو ایک گناہ کے ارتکاب کی بنا پر یا کسی بدعت کے قائل ہونے اور اس کی طرف دعوت دینے کی وجہ سے باطنی طور پر کافر نہ کہا جائے گا۔ چنانچہ جس شخص کے دل میں اللہ کے رسول ﷺ اور جو کچھ وہ لے کر آئے ہیں' پر ایمان ہو' لیکن بعض بدعات کی تاویل کرتے وقت غلطی کا شکار ہوا ہو تو وہ سرے سے کافر نہیں کہلایا جاسکتا۔''(۳)

اور یہ بھی کہا:

''اور یہی حکم ہے تمام بہتّر (۷۲) فرقوں کا' ان میں سے جو لوگ منافق ہیں وہ تو باطنی طور پر کافر ہیں' لیکن جو منافق نہیں بلکہ باطن میں اللہ اور اس کے رسولؐ پر ایمان رکھتے ہیں' وہ باطنی طور پر کافر نہ قرار دیے جائیں گے' چاہے انہوں نے تاویل کی بنا پر کوئی غلطی کیوں نہ کی ہو۔''(۴)

(۲) ذہبی کہتے ہیں:

''اور جو شخص چاہے کتنی ہی بڑی بدعت کی بنا پر کافر قرار دیا جائے وہ حقیقی کافر کی طرح نہیں ہے اور نہ ہی کسی یہودی یا مجوسی کی مانند۔ اللہ تعالیٰ کبھی نہ چاہیں گے کہ ایک شخص جو اللہ' اس کے رسول ﷺ اور یومِ آخرت پر ایمان رکھتا ہو' نماز' روزہ' حج ادا کرتا ہو' زکوٰۃ دیتا ہو' اور چاہے کتنی ہی بڑی بدعت کا مرتکب کیوں نہ ہو' وہ اس شخص کی طرح قرار دیا جائے جو رسول ﷺ سے دشمنی رکھتا ہو' بتوں کی عبادت کرتا ہو' شریعت کا منکر ہو اور کفر کا مرتکب ہو۔ ہاں! ہم بدعت اور بدعتیوں سے اللہ کے حضور اپنے آپ کو بریٔ الذّمہ قرار دیتے ہیں۔''(۵)

(۳) ابن الوزیر غلط کار تاویل کرنے والوں کے بارے میں لکھتے ہیں:

''اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿وَلٰكِنْ مَّنْ شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدْرًا فَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ مِّنَ اللّٰهِ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝۱۰۶﴾ (النحل) ''لیکن جو کفر کے بارے میں شرحِ صدر رکھتا ہو تو ان پر اللہ کا غضب ہو اور ان کے لیے بڑا عذاب ہے''۔ اس سے معلوم ہوا کہ تاویل کرنے والے کافروں سے جدا ہیں' کیونکہ انہیں کفر کے بارے میں نہ ہی قطعی طور پر' نہ ظنی طور پر شرحِ صدر حاصل ہے اور نہ ہی ان کے بارے میں کفر کا احتمال کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی تجویز کیا جاسکتا ہے۔''(۶)

(٤) المناوی کہتے ہیں:

''صحیح بات یہی ہے کہ تاویل کرنے والے بدعتیوں کی تکفیر نہ کی جائے' کیونکہ انہوں نے کفر کو اختیار کرنے کا قصد نہیں کیا' بلکہ حق جاننے کی کوشش کرتے رہے لیکن وہ حق تک نہ پہنچ سکے' اس لیے ان کی حیثیت ایسے مجتہد جیسی ہے جو غلطی کا مرتکب ہو۔ محقق علماء کا یہی قول ہے۔''(۷)

(۵) شیخ عبدالرحمٰن السعدی کہتے ہیں:

''اہل قبلہ میں سے تاویل کرنے والے وہ لوگ جو کتاب وسنت کے فہم میں غلطی اور گمراہی کے مرتکب ہوئے ہیں' حالانکہ وہ رسول پر ایمان رکھتے ہیں اور ان کے تمام اقوال کو سچا سمجھتے ہیں' انہیں حق گردانتے ہیں' اس پر عمل پیرا بھی ہوتے ہیں لیکن بعض علمی اور عملی مسائل میں غلط راہ پر چل پڑتے ہیں' تو کتاب وسنت کے مطابق ایسے لوگ دین سے خارج نہ سمجھے جائیں گے' ان پر کافروں کے احکام جاری نہ ہوں گے۔ صحابہ' تابعین اور ان کے بعد ائمہ سلف سب کے سب اس بات پر اجماع رکھتے ہیں۔''(۸)

(۶) شوکانی نے کتاب الأزھار(۹) کی ایک عبارت پر تنقید کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''ان کا یہ کہنا کہ 'مرتد کسی بھی اعتبار سے ہو تو وہ کافر ہے' تو وہ تاویل کرنے والوں کو بھی مرتد قرار دے رہے ہیں' تو یہاں ان کا قدم لڑکھڑا گیا ہے۔ ان کی یہ غلطی قابلِ معافی نہیں ہے' کیونکہ اگر یہ بات درست ہو تو اس زمین پر رہنے والے اکثر مسلمان مرتد قرار دیے جائیں گے۔ وہ اس لیے کہ مذاہبِ اربعہ کے پیروکار یا تو اشعری ہیں یا ماتریدی' اور وہ معتزلہ اور ان کے پیروکاروں کی تکفیر کرتے ہیں اور اس کے بالمقابل معتزلہ ان کی تکفیر کرتے ہیں۔ یہ سب کچھ شیطان کے ہتھکنڈوں میں سے ایک ہتھکنڈا ہے' تعصب بلکہ ظلم کی انتہا ہے' اور ہم نے اپنی تالیفات میں اس موضوع کو پوری طرح تفصیل سے بیان کیا ہے کہ جس کے بعد شکوک اور شبہات کا کوئی شوشہ باقی نہیں رہتا۔''(۱۰)

حواشی

(۱) الایمان الاؤسط' ص۱۶۳۔
(۲) الفتاوی ۳۵:۲۰۱۔
(۳) ایضاً ۷:۲۱۷۔
(۴) ایضاً ۷:۲۱۸۔
(۵) سیر اعلام النبلاء' ۱۰: ۲۰۳۔
(۶) ایثار الحق علی الخلق' ۲۲:۲۶۸۔
(۷) فیض القدیر ۴:۲۰۷۔
(۸) الارشاد فی معرفة الاحکام' ص ۲۰۷۔
(۹) کتاب الأزھار فی فقه الائمة الأخیار' زیدی فقہ کے بارے میں ہے اور اس کے مؤلف ہیں: احمد بن یحییٰ المھدی' ف ۸۴۰ھ۔
(۱۰) السیل الجرار ۴:۳۷۳ اور ۴:۵۷۶۔ البتہ ان کا یہ کہنا کہ مذاہب اربعہ کے ماننے والے یا تو اشعری ہیں یا ماتریدی' تو شاید ان کی مراد غالب اکثریت سے ہو' کیونکہ ان کے ماننے والوں میں بہت سے اہل سنت والجماعت بھی ہیں جو سلفی منہج کے قائل ہیں۔

فلسفۂ انقلاب کے نقطۂ نظر سے
سیرت النبی ﷺ کا اجمالی مطالعہ
منہجِ انقلابِ نبویؐ
غارِ حرا کی تنہائیوں سے لے کر
مدینۃ النبیؐ میں اسلامی ریاست کی تشکیل
اور اس کی بین الاقوامی توسیع تک'
اسلامی انقلاب کے مراحل' مدارج اور لوازم پر مشتمل
محترم ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ
کے دس خطباتِ جمعہ کا مجموعہ
صفحات: 375 ❁ اشاعت خاص:400روپے ❁ اشاعت عام:250روپے
''منہجِ انقلابِ نبویؐ'' کے مباحث کی تلخیص پر مشتمل کتابچہ
رسولِ انقلاب ﷺ کا طریقِ انقلاب
صفحات:64 ❁ قیمت اشاعت خاص:50روپے ❁ اشاعت عام:30 روپے
مکتبہ خدام القرآن لاہور
36۔ کے' ماڈل ٹاؤن لاہور' فون: 3-35869501

مولانا محمد منظور نعمانیؒ اور اباجی (۴)

بسلسلہ حاجی عبدالواحد صاحبؒ کی یادداشتیں

مرتب: پروفیسر حافظ قاسم رضوان

۱۵ فروری ۱۹۶۱ء کو اباجی رمضان المبارک حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ کے ہاں گزارنے کے لیے انڈیا روانہ ہوئے۔ ۲۱ فروری کو مولانا منظور نعمانی بھی اسی مقصد کے لیے رائے پور آ گئے۔ علی میاں پہلے ہی پہنچ چکے تھے۔ اس پر اباجی کا اظہارِ خوشی ہے کہ مدت کے بعد تینوں دوست (ارواحِ ثلاثہ) کچھ عرصہ کے لیے اکٹھے ہوئے ہیں۔ رمضان شریف کے معمولات کی وجہ سے روزانہ نشست تو ممکن نہیں تھی، پھر بھی درمیان درمیان میں ایک دوسرے سے مجلس ہوتی رہتی۔

۳ مارچ کو مولانا نعمانی کے ساتھ کچھ یوں تبادلہ خیال ہوا: ''مولانا محمد منظور صاحب نعمانی راستہ میں مل گئے۔ ڈائری دیکھ کر پوچھی اور عاجز سے لے کر بعض مقامات سے پڑھی۔ ان سے بھی علی میاں کا کل والا ذکر ہوا کہ آخر معاشرہ کا کیا بنے گا۔ ان کے نزدیک بچوں کی تعلیم کا انتظام‘ تبلیغ کی چلت پھرت اور دینی مدارس کی اصلاح‘ تینوں کرنے کی چیزیں ہیں اور ان سے خیر کے جاری رہنے کے امکانات ہیں۔ عاجز نے عرض کی کہ سب کچھ ان خدمات کے کرنے والوں پر منحصر ہے۔ جن کی نظروں میں مادی منافع اور دنیاوی بہتری کی نسبت اخلاقی قدریں اور روحانی ترقی زیادہ وقیع ہیں‘ وہ تو کچھ نہ کچھ اچھا کام ہی کریں گے‘ ورنہ خدمت کے نام پر بھی خودغرضی ہی چلے گی۔ جس نے بھی اور جہاں بھی اور جب بھی ترقی کی ہے‘ وہ باہمی اعتماد اور حسنِ سلوک سے کی ہے‘ اس کے بغیر کوئی کام بھی مشکل ہے۔ علمی خدمت تو لکھنے اور بولنے تک موقوف ہے۔ چلت پھرت میں جو بات کہی اور سنی جاتی تھی‘ وہ عمل میں نہ پائی گئی۔ کہیں پر کوئی پیچ ڈھیلا ہے اور کسی چیز کی کمی ہے۔ وہ دینی تربیت کہاں اور کیسے ملے؟ وقت کا یہ سب سے بڑا سوال ہے''۔ اباجی کی متفکّر طبیعت کو اس پر بھی چین نہ آیا‘ اور مولانا محمد منظور نعمانی سے سوتے وقت یہ بات کہی کہ تحریر کا اثر مسلّم اور احیائے ملّت کا پروگرام تصدیق شدہ‘ مگر اسے عمل میں کون لائے گا؟ وہ لوگ کہاں سے آئیں گے جو فی سبیل اللہ جان اور مال‘ وقت اور محنت دیں‘ نہ تھکیں‘ نہ بے صبری کریں؟

۴ مارچ ۱۹۶۱ء کو ظہر کے بعد مولانا نعمانی اور علی میاں سے ایک مشترکہ نشست ان کے کمرے میں ہوئی۔ ''احیائے اسلام کے لیے جماعت چاہیے‘ اور اچھوں اچھوں کے پاس کام کے آدمی نہیں جو تعاون میں قربانی کر سکیں۔ اپنا ندوہ میں عربی پڑھنا‘ کوئٹہ میں احباب کا حلقہ بنانا اور اس کا ٹوٹ جانا۔ پھر ملازم رہ کر پس انداز کرنا اور فارغ ہو کر اجنالہ (ضلع امرتسر) میں کام کی طرح ڈالنا‘ اس میں کامیابی اور ناکامی۔ تقسیم ہند کے بعد لاہور میں قیام‘ حجاز کا سفر اور دعا اور رونا‘ وہاں جو کچھ دیکھا‘ لاہور واپس آ کر رضوان کی بنیاد‘ کامیابی اور ناکامی‘ جان اور مال لگانے والے مردانِ کار کیسے بنیں؟ دونوں احباب نے کہا کہ تین بار کا تجربہ ثابت کرتا ہے کہ اس وقت نہ کوئی جوڑنے والی ہستی ہے‘ نہ جڑنے والے لوگ‘ یہ کام نہیں ہو سکتا۔ اس لیے اور جو بھی ہو سکے‘ وہی کر لو۔ وہ تو اس مایوسی میں پختہ ہو چکے ہیں۔''

اگلے دن نعمانی صاحب سے اباجی کی پھر سیر حاصل گفتگو ہوئی۔ انہوں نے بھی عوام کے ساتھ رابطہ کم ہو جانے کو تسلیم کیا اور اس کی وجوہات بتائیں۔ ''ندوہ کی ترقی اور ایک تحریک بن جانا‘ طلبہ اور بجٹ میں اضافہ‘ نئی تعمیر‘ برما کا سفر‘ تعلیمی شغف‘ تصنیف میں انہماک‘ کچہری روڈ پر تبلیغی مرکز‘ اور علی میاں کی موجودہ مقبولیت اور بین الاقوامی حیثیت‘ ازدواجی المیہ‘ وغیرہ''۔ اگلے دن اباجی نے نعمانی صاحب سے دورانِ گفتگو اپنی طبیعت کے بارے میں بھی ذکر کیا کہ وہ تخلیہ کی جانب مائل ہے اور زیادہ ملنا جلنا پسند نہیں کرتی۔ پھر بھی لوگوں کا حق سمجھ کر خندہ پیشانی سے ملنا چاہیے۔ ۹ مارچ ۶۱ء کو اباجی کا پھر مولانا نعمانی سے تبادلہ خیال ہوا۔ شفاعت کے مسئلہ پر گفتگو ہوئی۔ سارے قرآن مجید میں سوائے شفاعت کی نفی اور انکار کے کہیں صاف طور پر شفاعت کیے جانے کا ذکر نہیں۔ جہاں ذکر ہوا ہے‘ یونہی ہوا ہے کہ اجازت کے بغیر کوئی شفاعت نہ کر سکے گا۔ اور اجازت کُلُّھُم اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے‘ جسے چاہے دے‘ کسی شخص کی اپنی مرضی کا اس میں کوئی دخل نہیں ہوگا۔ لوگوں کو ہندوانی دیومالا کے سننے کی وجہ سے غلط فہمی ہو جاتی ہے اور اللہ کے سوا اوروں سے آس لگائے بیٹھتے ہیں۔ قیامت کے دن یہ آسرے کام نہ دیں گے۔ مگر اس وقت کیا ہو سکے گا؟

اگلے دن جمعہ کی تقریر مولانا نعمانی نے مدرسہ کے پاس والی مسجد میں کی جس میں دنیاوی اور اخروی زندگی کا موازنہ کیا۔ اس دنیا کا نفع و نقصان تو ہر ایک کو نظر آتا ہے‘ مگر آنے والی زندگی کا نفع نقصان پیغمبروں نے بتایا ہے۔ موجودہ دور میں آنے والی زندگی کے لیے نیک عمل کرنا‘ برے اعمال سے بچنا اور کمی بیشی پر توبہ کرنا۔ مگر اپنی اولادوں کو بھی اس راہ پر قائم کرنے کے لیے ان کی تعلیم کا انتظام ضروری ہے۔

(قریبی) بستی میں ہر چولہے پر چٹکی کا سلسلہ چلایا گیا ہے۔ آٹا' دال' چاول کی چٹکی اپنے نکالے ہوئے حصہ میں سے نکالنی ہوتی ہے۔ ایک تو چندہ کے بغیر دینی اسکول چلے گا' دوسرے اس مدرسہ میں بچے بھیجنے کی ترغیب ہوگی۔ ہر دو گھروں پر ایک نوجوان اپنی چچی صاحبہ کو چٹکی کی یاد دلوانے اور ضرورت ہو تو بچے کو مدرسہ لے جانے کے لیے مقرر کیا جائے گا۔ یہ دین کو زندہ رکھنے کے لیے ضروری ہے۔ بعد میں مولانا نعمانی نے اباجی کو اسکولوں میں اردو کی درس و تدریس کے لیے کی جانے والی جدوجہد کے بارے میں بتایا۔ اس ضمن میں بچوں کے والدین اور دیگر قومی کارکنوں کا تعاون بھی حاصل کیا گیا ہے۔ عید سے دو چار روز پہلے مولانا محمد منظور نعمانی واپس تشریف لے گئے۔ جاتے ہوئے اباجی کو اپنی کتاب ''قرآن آپ سے کیا کہتا ہے'' ہدیہ کر گئے۔

۴ فروری ۱۹۶۲ء کو اباجی حسبِ معمول حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوری کے ہاں رمضان المبارک گزارنے کے لیے لاہور سے روانہ ہوئے۔ دوسرے عشرے کے شروع میں مولانا نعمانی بھی رائے پور پہنچ گئے۔ دیگر معمولات کے علاوہ اباجی سے بھی ان کا تبادلہ خیال کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ ایک نشست کا لب لباب کچھ یوں ہے: ''نعمانی صاحب سے ان کی عام خاموشی اور علیحدگی کا تذکرہ کیا کہ اس تنہائی اور بظاہر بیزاری سے آدمی تو نہیں جڑتے۔ دینی کام کرنے والے کو تو اول و آخر آدمیوں سے ہی واسطہ پڑتا ہے' کیونکہ دین آدمیوں کے لیے ہی ہے' اور کتابیں دین کے لیے۔ اور آدمیوں سے خواہ کتنی ہی ناامیدی ہو' پھر بھی جب کام پڑے گا (تو) ان سے ہی نکلے گا۔''

اگلے دن پھر اباجی کی مولانا نعمانی سے تفصیلی نشست ہوئی۔ ''نعمانی صاحب سے وقت لے کر پہلے اپنی کیفیت سنائی۔ دوستوں سے دل پاک۔ خالی میدان میں اللہ کی رضاجوئی کا شوق' اپنی مرضی کی بجائے احکام خداوندی کی بجاآوری۔ اطمینانِ قلب اور نصرتِ الٰہی۔ ہر چیز اور حالت منجانب اللہ ہونے کا احساس۔ پھر اس پر صبر اور اپنے فریضہ کی ادائیگی۔ چھوٹے بھائی کی وفات پر اللہ کی جانب سے صبر کی توفیق' نعمانی صاحب کو فریضہ کے طور پر اللہ کے بھیجے ہوئے آدمیوں سے ملنے اور جڑنے کی ترغیب۔ ان کا اتفاق۔''

تیسرے دن کی آخری تفصیلی نشست کا حال روزنامچہ میں کچھ یوں رقم ہے: ''صبح مولانا محمد منظور نعمانی صاحب سے وقت لے کر پھر تفصیلی بات کی اور پہلی بات میں جو خالی مقامات رہ گئے تھے' انہیں پر کر کے بات کو مکمل کر دیا۔ چودھری نیاز علی خاں کا خط اور جواب۔ دوسرے دن حضرت کی مجلس اور آزاد صاحب کا کتاب پڑھنا۔ اللہ کی رضا' نبی کی پیروی' شیخ سے مناسبت' اور جملہ مخلوق کا جنازہ' یعنی بے غرض مروت' تازہ تجربہ سے بات کا سمجھ لینا۔ چودھری نیاز علی کو شکریہ کا خط'

دل کا محاسبہ' مخلوق کی محبت کے آثار بھی اور کھنڈر بھی' مراقبہ ذکر سرّی کے ساتھ' دوستوں کو رخصت کرنا' چند بار کوشش سے ایک دو اور پھر سب کا رخصت ہو جانا' دل کا میدان مخلوق کی محبت سے پاک' اب مالک کی محبت اور رضاجوئی۔ دوستوں کی محبت کے ساتھ اپنی خواہش اور مرضی بھی گئی۔ اب ہر کام میں اللہ کی حکمت نظر آنے لگی۔ اور اسی حکمت کے ماتحت اپنا فریضہ بھی نظر آنے لگا۔ اس کے سرانجام دینے کی کوشش میں اللہ کی مدد اور آسانی۔ اللہ کی مخلوق میں انسان کا درجہ اور اہمیت' تو اللہ کے غلام کے فریضہ میں بھی انسان کا وہی درجہ اور اہمیت' اسے شوق سے سرانجام دینا' مالک کی رضا۔ صبح کی سیر میں یہ بات ہوگئی۔ نعمانی صاحب نے بات سے اتفاق کیا۔ مولانا نعمانی رمضان المبارک کے آخر میں واپس تشریف لے گئے اور مولانا علی میاں کی آمد ہوئی۔ عید کے فوراً بعد اباجی علی میاں کے ہمراہ لکھنؤ چلے آئے۔ اور کچھ عرصہ یہاں گزارا۔''

مولانا نعمانی اور علی میاں سے ایک مشترکہ اظہار خیال کا ذکر ۱۷ مارچ ۱۹۶۲ء کو یوں ہے:

''علی میاں اور نعمانی صاحب سے کھل کر بات ہوئی۔ کتابوں کا لکھنا آدمیوں کے جوڑنے کا واسطہ ہونا چاہیے۔ ان کا موقف یہ تھا کہ بار بار کے تجربہ نے ثابت کر دیا ہے کہ یہ ان کے مزاج کے مطابق نہیں اور ان کے بس کی بات نہیں۔ وہ جس کام کے اہل ہیں' وہ کر رہے ہیں اور کرتے رہیں گے۔ اس سے آگے جو اللہ کو منظور ہوگا اور جب اور جیسے اور جس کے ہاتھوں منظور ہوگا' ہو جائے گا۔ ان شاء اللہ! حضرت اقدسؒ بھی اسی کی ہمت افزائی اور اس پر خوشنودی کا اظہار فرماتے ہیں۔ ہر آدمی سے اس کی صلاحیت کے مطابق ہی کام لیا جا سکتا ہے۔''

۱۹ مارچ کو اباجی اور مولانا نعمانی اکٹھے صبح کی سیر کو گئے۔ دورانِ گفتگو ہندوستان میں آزادی سے قبل و بعد مسلمانوں کا مقام اور مسلم سیاست کا جائزہ بھی لیا جاتا رہا: ''کانگریس کا ارتقاء' پہلی وزارتوں کا تاثر' لیگ کو تقویت' پٹیل' جواہر لعل (نہرو) اور گاندھی کی تبدیلیٔ رائے' مہاسبھا کا زور' تقسیم ملک' جن سنگھ کی بنا' گاندھی کا قتل' جواہر لعل کا ثبات' پہلا الیکشن' مسلمانوں کا سکوت' دوسرا الیکشن' مسلمانوں کی اہمیت کا احساس' جن سنگھ کے فسادات' جبل پور (و) علی گڑھ (و) میرٹھ' کانگریس کا احساس' مسلمانوں کو خطاب' بیداری اور ووٹ کا استعمال' رہنمائی اور رسالہ' جن سنگھ کا تذبذب' اور موقف کی توضیح''۔ (ان جامع نکات کے ذریعے دریا نہیں بلکہ سمندر کو کوزے میں بند کر دیا گیا ہے' راقم۔)

رات کے کھانے پر پھر اباجی اور مولانا نعمانی کی باہمی نشست ہوئی۔ ''شام کے کھانے کے بعد نعمانی صاحب سے سیر حاصل گفتگو ہوئی۔ کسی دوست میں کوئی کمزوری ہے کسی میں کوئی'

جامع شخصیت تو شاذ و نادر ہی ملتی ہے۔ سیماب وار بے چینی اور برداشت کی کمی‘ خاموشی اور بے توجّہی‘ اور اپنے اندر انہماک‘ باتوں کی بیماری اور نبی کی نقل‘ بجائے پیروی کے‘ کسی کو خاطر میں نہ لانا‘ وغیرہ۔‘‘

۲۱ مارچ ۱۹۶۲ء کو اباجی کی مولانا محمد منظور نعمانی سے لکھنؤ میں سلسلۂ ملاقات کی آخری نشست ہوئی۔ ’’نعمانی صاحب سے اپنی خوش قسمتی کا تذکرہ کیا کہ رائے پور کے ایک ماہ کے قیام کے بعد لکھنؤ کا بھی قریباً نصف ماہ کا قیام نصیب ہوا۔ اور نعمانی صاحب اور علی میاں کو بیرونی اثرات سے آزاد اپنے اصلی مستقر اور مرکز پر باہمی تعاون سے کام کرتے ہوئے دیکھا اور اس کام کے اثرات (بھی) دیکھے۔ جس سے ان دونوں کی محبت‘ عقیدت اور عظمت دل میں بہت بڑھ گئی‘ دونوں بزرگوں کو ہندی میں دیوتا کہا جاسکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اور توفیق عطا فرمائے اور قبول فرمائے۔ آمین۔‘‘ اس باہمی تبادلہ خیال کے بعد مولانا نعمانی بیرونِ لکھنؤ کسی کام سے تشریف لے گئے۔ اباجی مزید چند روز مرکز تبلیغ اور ندوۃ العلماء لکھنؤ ٹھہرے۔ اور ۴/اپریل ۱۹۶۲ء کو یہاں سے روانہ ہوکر بذریعہ ٹرین بنگلہ والی مسجد‘ نظام الدین‘ دہلی سدھارے‘ جہاں مولانا محمد یوسف اور دیگر تبلیغی اکابرین کی معیت میں کچھ عرصہ گزارا۔ ہفتہ‘ دس دن بعد علی میاں بھی مع احباب کے آ گئے۔ اباجی علی میاں کے ہمراہ سہارنپور اور حضرت شیخ سے ملنے کے بعد ۱۶/اپریل کو رائے پور پہنچے تو مولانا نعمانی پہلے سے ہی وہاں موجود تھے۔

۱۷ اپریل کے روزنامچہ کی تحریر ہے: ’’مولانا محمد منظور نعمانی سے بھی مشورہ ہوا‘ اور نعمانی صاحب دن ڈھلے رخصت ہوئے۔ اب ان سے ملاقات قسمت سے ہے‘ کیونکہ اس وقت ان کے پاس (پاکستان کا) پاسپورٹ نہیں‘ اور عاجز کا اب طویل سفر کا یارا نہیں۔ ویسے اللہ مالک ہے‘ اور جب چاہے اچھے حالات میں ملا سکتا ہے۔‘‘

مئی ۱۹۶۲ء کے اوائل میں اباجی کی ہندوستان سے واپسی ہوئی۔ اس کے بعد اباجی بوجوہ دوبارہ انڈیا نہ جا سکے۔ دستیاب روزنامچوں کے مطابق مولانا محمد منظور نعمانی کی طرف سے ۲۸ جنوری ۱۹۶۷ء کو ان کا خط اور کتاب ’’آپ حج کیسے کریں‘‘ بذریعہ رجسٹری اباجی کو موصول ہوئی۔ ۲۱/جنوری ۱۹۶۸ء کو اباجی حج کے لیے کراچی سے بذریعہ ہوائی جہاز جدہ روانہ ہوئے۔ پہلے پہنچ جانے پر فروری کا مہینہ وہیں گزرا۔ حج سے ذرا پہلے ۳ مارچ کو اباجی کی اچانک حرم شریف میں مولانا منظور نعمانی سے ملاقات ہوئی‘ طرفین کی خوشی دیدنی تھی۔ درمیان میں ایک دو قدرے مختصر

ملاقاتیں ہوئیں۔ آخر واپسی سے پہلے اباجی کی ۱۵ مارچ کو ایک بھرپور ملاقات مولانا نعمانی سے ناشتہ پر ہوئی۔ اس ناشتے کا اہتمام اباجی کی طرف سے تھا اور تیار مولانا نعمانی کے گھر والوں نے کیا تھا۔ ۱۶/مارچ کو مدرسہ صولتیہ میں اباجی کی موجودگی میں مولانا عبید اللہ بلیاوی‘ مولانا نعمانی اور دیگر چند اکابرین میں (باہمی) مجلس کا ذکر ہے: ’’کون کسے کس حد تک برداشت کر سکتا ہے‘‘۔ ۱۸ مارچ کو اباجی کی تبلیغی رفقاء کے ہمراہ کراچی واپسی ہوئی۔ یکم اکتوبر ۱۹۶۹ء کو ڈائری میں مولانا نعمانی کے خط ملنے کا ذکر ہے کہ عنقریب وہ اور علی میاں رابطہ عالمِ اسلامی کی مجلس میں شرکت کے لیے حجاز (سعودی عرب) جانے والے ہیں۔

درمیانی کسی سال میں اباجی نے کسی ذریعے سے علی میاں کے نام خط بھیجا تھا‘ جس کے ساتھ مولانا نعمانی کے نام کا مکتوب بھی تھا۔ اس حوالے سے یکم اپریل ۱۹۷۶ء کو اباجی کے روزنامچے میں یوں ذکر ہے: ’’علی میاں نے عاجز کا ایک دستی خط منظور نعمانی صاحب کو دے دیا تھا‘ جسے انہوں نے نام حذف کر کے الفرقان‘ جون ۱۹۷۳ء میں چھاپ دیا تھا۔ عاجز کو جب اس کا پتہ چلا تو اس نے الفرقان کا وہ پرچہ بھجوا دینے کی خواہش ظاہر کی۔ آج وہ پرچہ وصول ہو گیا۔ حنیف میاں (محمد حنیف ورک‘ داماد) نے عاجز کا چھپا ہوا خط پڑھ کر سنایا۔ راحت میں شکر اور مصیبت میں صبر اور راضی برضا رہنے کا مضمون تھا۔ اللہ انعام دے کر بھی امتحان لیتا ہے اور ابتلا میں ڈال کر بھی‘ اور اس کی ہدایت و نصرت مانگنے والوں کے لیے ہمیشہ موجود رہتی ہے‘‘۔ رسالہ ملنے کے بعد ۷/اپریل کو مولانا محمد منظور نعمانی کے خط ملنے کا تحریر ہے۔ ۲۲/جون ۱۹۷۷ء کو اباجی کے نام مولانا نعمانی کے خط ملنے کا تذکرہ کچھ اس طرح سے ہے: ’’آج حضرت مولانا محمد منظور نعمانی مدظلہ کا خط ملا۔ طویل بیماری کے بعد روبصحت ہیں۔ کمزوری کی وجہ سے یہاں آنے کا ارادہ ملتوی کر رکھا ہے۔ علی میاں تو امریکہ گئے ہوئے ہیں۔ شاید وہاں آنکھ کا آپریشن بھی کروالیں۔ اللہ تعالیٰ دونوں کو صحت کاملہ عاجلہ عطا فرمائے۔ آمین‘‘۔ اس کے بعد ۲۴ جنوری ۱۹۷۸ء کو دوبارہ اباجی کے نام مولانا نعمانی کا خط کوئی صاحب دستی دے گئے۔ روزنامچے میں تحریر ہے کہ ’’ایک آدمی مولانا محمد منظور نعمانی کا لکھنؤ سے خط دے گیا۔ پرانے دوست اور دین کی خدمت کے ساتھی ہیں۔ احیائے اسلام کی تمنا دل میں لیے لیے پھرتے ہیں۔ کولہے میں تکلیف کے باعث چلنے پھرنے میں دقت ہے‘ بیٹھ کر نماز پڑھتے ہیں اور کچھ لکھ بھی لیتے ہیں۔ علی میاں کا لکھا کہ اس وقت مدینہ منورہ گئے ہوئے ہیں۔ ان کا ایک خط پہلے سے بھی زیر جواب رکھا ہے۔‘‘

لیکن ابھی اباجی کی مولانا محمد منظور نعمانی سے ایک آخری ملاقات قدرت کو منظور تھی۔ جولائی ۱۹۷۸ء میں رابطہ عالم اسلامی کی طرف سے ایک ایشیائی اسلامی کانفرنس کراچی میں منعقد ہوئی۔ ہندوستان کی طرف سے مولانا محمد منظور نعمانیؒ اور سید ابوالحسن علی ندوی (علی میاںؒ) بھی شریک ہوئے۔ کانفرنس کے اختتام پر مولانا نعمانی، حکیم عبدالرحیم اشرف، مدیر المنبر، کی دعوت پر فیصل آباد تشریف لے گئے۔ اباجی کا وہیں پر مولانا نعمانی سے ٹیلی فون پر رابطہ ہوگیا۔ لاہور آنے پر آپ کا قیام ڈاکٹر منیر الحق (مشہور ماہرِ چشم اور تبلیغی بزرگ) کے گھر واقع سمن آباد میں ہوا۔ اباجی راقم کے ساتھ مولانا کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ مولانا نعمانی کی ناسازیٔ طبع کی بنا پر زیادہ دیر تک یہ بے تکلف مجلس قائم نہ رہ سکی۔ رخصت ہونے پر مجھے بھی مولانا نے خصوصی دعاؤں سے نوازا (ایسی دعائیں ہی مجھے ابھی تک لیے چل رہی ہیں اور ان شاء اللہ لیے چلتی رہیں گی، راقم) اباجی کے کہنے پر ڈاکٹر اسرار احمد کے ہاں بھی مولانا نعمانی کا ایک ناشتہ طے تھا، لیکن طبیعت کی کمزوری اور نڈھال ہونے کی وجہ سے اس پر عمل درآمد نہ ہوسکا۔ اباجی اور ڈاکٹر صاحب دونوں کو اس کا افسوس رہا۔ کچھ دن قیام کے بعد مولانا نعمانی واپس تشریف لے گئے۔

آخر میں مولانا محمد منظور نعمانی کے چند ارشادات و تاثرات پیش خدمت ہیں:

⊙ ''تحدیثِ نعمت کے ضمن میں میرے لیے یہ بات مستقل طور پر کہنے کی ہے کہ اللہ نے میرے لیے یہ بات بالعموم آسان ہی رکھی کہ اپنی غلطی کا اعتراف کرنے سے نہ شرماؤں اور حتی المقدور اس کی تلافی کی بھی کوشش کروں، اور یہ یقیناً وہ چیز ہے کہ اللہ اگر توفیق نہ دے انسان کے بس کا کام نہیں۔''

⊙ 'دعا' سے اپنی مناسبت کا ذکر کرتے ہوئے مولانا نعمانی رقم طراز ہیں: ''دعا کو حدیث نبویؐ میں مُخُّ الْعِبَادَة (عبادت کا مغز اور جوہر) کہا گیا ہے۔ اللہ کا اس گناہگار پر یہ غیر معمولی احسان ہے کہ اسے طبعی طور پر دعا سے مناسبت بخشی گئی ہے۔ اور وہ دعائیں جو آنحضرت ﷺ سے ماثور اور منقول ہیں، ان کے بارے میں تو اللہ نے مزید یہ بات بھی نصیب فرمائی ہے کہ وہ اس ضعیف الایمان کے ایمان میں مضبوطی اور ترقی کا ذریعہ بنتی ہیں۔ اور اگر ایمانی معاملات میں کوئی وسوسہ دل میں کبھی گزرنے لگتا ہے، تو ان دعاؤں کا دھیان اس کے دفعیہ کے لیے سب سے زیادہ تیر بہدف نسخہ ہوتا ہے۔''

⊙ ایک خاص ذہنی مناسبت والی دعا کا حوالہ دیتے ہوئے مولانا لکھتے ہیں: ''اللہ کے بے شمار احسانات ہیں، ایک خاص قابلِ ذکر احسان اس عاجز بندے پر یہ بھی ہے کہ اسے اپنے حق میں

ہمیشہ اس دعا کی توفیق رہی: اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنِیْ فِیْ عَیْنِیْ صَغِیْرًا وَفِیْ اَعْیُنِ النَّاسِ کَبِیْرًا (اے اللہ! مجھے اپنی نظر میں چھوٹا اور دوسروں کی نظر میں بڑا بنا دے!) میرے جیسے لوگ جنہیں کچھ خاص حالات کی بنا پر شروع ہی سے تھوڑی بہت بڑائی لوگوں کی نظر میں ملنا شروع ہو جاتی ہے اور خود ان کے اوپر کوئی بڑا نگران نہیں ہوتا، ان کے لیے یہ وقت بڑی آزمائش کا ہوتا ہے کہ برخود غلط نہ ہو جائیں۔ میرے مالک کا بہت بڑا احسان ہے کہ اگرچہ وہ عجز و تواضع تو کبھی نصیب نہ ہوئی جو آدمی کی اصل بڑائی ہے، مگر اس حقیقت کے شعور سے اور اس کے لیے دعا کی توفیق سے بہرحال محرومی نہیں رہی۔''

⊙ یوں سمجھئے کہ نہایت پیاری اور بے حد شیریں عربی زبان بولنے والا اور عربی مبین میں ہی خدا کا 'پیغامِ ہدایت' سنانے والا ایک زندہ جاوید پیغمبر (بشکل قرآن) ہمارے گھروں میں آج بھی موجود ہے، لیکن ہمارا برتاؤ اس کے ساتھ کیا ہے؟ کتنے ہم میں ہیں جو اس سے ہدایتی تعلق رکھتے ہیں؟ کتنے ہیں جو اس سے اچھی طرح فیض حاصل کرنے کے لیے اور اس کو براہِ راست سمجھنے کے لیے عربی سیکھ چکے ہیں یا سیکھ رہے ہیں؟ اور کتنے ہیں جو عربی زبان نہ جاننے اور اس کے لیے کوئی ذریعہ بھی نہ پا سکنے کی مجبوری سے کسی اردو ترجمہ یا تفسیر کی روشنی میں یا اس قرآن کے کسی حلقہ میں شریک ہو کر اس کی بات سمجھنے اور اس سے ہدایت حاصل کرنے کی کوشش کرتے اور اس کے لیے اپنے وقت کا کچھ حصہ صرف کرتے ہیں؟

ذرا ہندوستان ہی کے 'نو کروڑ مسلمانوں' (صفر ۱۳۶۲ھ) پر اس جہت سے ایک نظر تو ڈالئے اور سوچیے کہ کتنی گہرائی ہے ان کے ایمانی دعوؤں میں، اور کتنا تعلق ہے ان کو اللہ اور رسول ﷺ اور ان کے پیغاموں سے۔ اللہ کے بندو! رسول ﷺ کی محبت کا دم بھرنے والو! اور قرآن کی عظمت و تقدیس کی قسمیں کھانے والو! اللہ و رسولؐ کے اس مقدس پیغام (قرآن) کے ساتھ یہ بے اعتنائی اور یہ لاپرواہی!

کیا خدا کے سامنے اپنے اس تغافل مجرمانہ کی تم جواب دہی کر سکو گے؟ اور کیا عذر ہوگا تمہارا اُس وقت جب ربّ العزت کے تختِ جلال کے سامنے اس کا رسول (حضرت محمد ﷺ) فریادی بن کر درد و حسرت کے ساتھ کہتا ہوگا: ﴿یٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِی اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا ﴿۳۰﴾﴾ (الفرقان) ''اے میرے خداوند (ربّ) میری اس قوم نے اس قرآن کو بالکل چھوڑ رکھا تھا۔''

البتہ یہ بات بہرحال اور سب کے لیے ملحوظ رکھنے کی ہے کہ قرآن مجید 'هُدًى لِّلْمُتَّقِیْنَ' ہے،

لہٰذا اس سے ہدایت و نصیحت کا نور انہی خوش بختوں کو حاصل ہوسکتا ہے‘ جن میں ’تقویٰ‘ ہو‘ یعنی اللہ کا خوف اور عاقبت کی فکر ہو اور اسی کی بے چینی ان کو طلب ہدایت کے لیے قرآن پاک کے پاس لانے والی ہو‘ نہ کوئی اور شوق اور نہ کوئی دوسری غرض۔ ورنہ ہم اور آپ سب ہی جانتے ہیں کہ ابوجہل اور ابولہب تو آج کل کے ہر بڑے سے بڑے عالمِ دین سے بہتر قرآن کی زبان جانتے تھے‘ لیکن چونکہ دل ایمان اور تقویٰ سے خالی تھے‘ اس لیے اس بحرِ ہدایت سے ان کو ایک قطرہ بھی نہیں مل سکا۔

﴿وَمَا تُغْنِي الْاٰيٰتُ وَالنُّذُرُ عَنْ قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ ﴿١٠١﴾﴾ (سورۂ یونس)

’’(اور جو لوگ ایمان نہیں لاتے‘ ان کو نشانیاں اور دھمکیاں کچھ فائدہ نہیں پہنچاتیں۔‘‘

﴿اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ؕ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَيُقْتَلُوْنَ ۖ وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ وَالْقُرْاٰنِ ؕ وَمَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ مِنَ اللّٰهِ فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَيْعِكُمُ الَّذِيْ بَايَعْتُمْ بِهٖ ؕ وَذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿١١١﴾﴾ (سورۃ التوبہ)

’’بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے ان کی جانوں کو اور ان کے مالوں کو اس بات کے عوض خرید لیا ہے کہ انہیں جنت ملے گی‘ وہ لوگ اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں‘ جس میں قتل کرتے ہیں اور قتل کیے جاتے ہیں‘ اس پر سچا وعدہ کیا گیا ہے تورات میں اور انجیل میں اور قرآن میں‘ اور اللہ سے زیادہ اپنے عہد کو کون پورا کرنے والا ہے‘ تو تم لوگ اپنے اس سودے پر جس کا تم نے معاملہ ٹھہرایا ہے‘ خوشی مناؤ‘ اور یہ بڑی کامیابی ہے۔‘‘

مطلب یہ ہے کہ جو سچے ایمان والے ہیں‘ ان کی جانیں اور ان کے اموال اللہ تعالیٰ نے جنت کے بدلے خرید لیے ہیں‘ اب کسی سچے مسلمان کی جان و مال اس کی اپنی ملک نہیں ہے‘ بلکہ وہ اللہ کے ہاتھ بیچ چکا ہے۔ اب ان کا کام یہ ہے کہ جب ان کو راہِ خدا میں جہاد اور جانبازی کے لیے پکارا جائے‘ وہ لبیک کہہ کر میدان میں آ جائیں‘ خدا کے اور اس کے دین کے دشمنوں کے مقابلہ میں جنگ کریں‘ ماریں اور مریں۔ اور اس طرح خدا کے ہاتھ بیچی ہوئی جان و مال اس کی راہ میں قربان کر دیں اور اس کے عوض جنت اور اس کی لازوال نعمتیں اور ابدی عیش و آرام حاصل کریں۔ آگے فرمایا گیا ہے: ﴿وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ وَالْقُرْاٰنِ ؕ﴾ یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ معاملہ بالکل پکا ہے‘ کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے۔ پہلے مقدس صحیفوں تورات و انجیل میں بھی اس کا اعلان ہو چکا ہے اور اب قرآن میں بھی اس کی ضمانت دی جا رہی ہے‘ اور خدا سے

زیادہ وعدے کا سچا کون ہوسکتا ہے۔ آگے فرمایا گیا ہے کہ مؤمنین کا اپنے اللہ کے ساتھ یہ ایسا نفع بخش سودا ہوا ہے‘ جس پر انہیں جتنی بھی خوشی اور مسرت ہو‘ برحق ہے‘ یہ ان کی بڑی فیروزمندی ہے‘

﴿وَذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿١١١﴾﴾

ذرا غور کیجیے! اللہ ہی کی دی ہوئی ایک فانی جان جو دیر سویر ختم ہونے والی ہے‘ اور مال و دولت جس کو یا خرچ ہونا ہے یا مر کر ترکہ میں چھوڑ دینا ہے‘ اس کو اللہ کے حکم پر اس کی راہ میں قربان کر کے آخرت کی حیاتِ ابدی اور جنت حاصل کر لینا کتنا نفع بخش سودا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے قدردانی دیکھیے کہ وہ خود ہمارا خریدار اور طالب بنا ہے‘ یہ نہیں فرمایا کہ مؤمنین نے اپنی جان اور مال کے عوض ہم سے جنت خرید لی ہے‘ بلکہ یوں فرمایا کہ ہم نے جنت ان کے لیے لکھ دی ہے اور اس کے بدلے ان کی جانیں اور ان کے مال ہم نے خرید لیے ہیں‘ ہم ان کے خریدار بنے ہیں۔ خرید و فروخت کے معاملے میں ہمیشہ خریدنے والا طالب ہوتا ہے‘ جو قیمت ادا کر کے مطلوب چیز کو خرید لیتا ہے‘ قیمت کی حیثیت تو خرید و فروخت کے ایک وسیلے کی ہوتی ہے۔

⊙ اللہ نے اپنے ان دوستوں کی اور ان اپنوں کی پہچان بتائی ہے: ﴿اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ ﴿٦٣﴾﴾ (سورۂ یونس) ’’یہ وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے اور (برائیوں سے) پرہیز رکھتے ہیں‘‘۔ ایک تو ان لوگوں نے ایمان کی دولت حاصل کر لی ہے اور دوسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش ہونے اور اس کی بندگی کا احساس مسلسل انہیں رہتا ہے۔ غفلت اور بھول ان کا مستقل حال نہیں ہے‘ بلکہ ان کا مستقل حال تو یاد اور احتیاط ہی ہے‘ کبھی کبھی بھول جانا الگ بات ہے‘ مسئلہ اصل مستقل حال کا ہے‘ سو وہ ان لوگوں کا درست ہو جاتا ہے۔

دوستو! پس دو باتیں ہیں اللہ کا ولی بننے کے لیے‘ ایک ایمان دوسرا تقویٰ۔ ایمان کا مطلب یہ کہ دل میں یہ یقین اتر جائے کہ جو کچھ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا‘ وہ بالکل برحق ہے اور اسی میں کامیابی ہے‘ اور تقویٰ یہ کہ اس یقین کے مطابق زندگی میں احتیاط اور پابندی کی عادت پڑ جائے‘ بے لگام زندگی سے پیچھا چھوٹ جائے۔ عام طور پر لوگوں نے اللہ کے ولی ہونے کے جو مطلب سمجھ رکھے ہیں‘ یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ وہ سمجھتے ہیں کہ فلاں فلاں بزرگانِ دین اولیاء اللہ تھے اور بس!

کیا حضور ﷺ صرف اس لیے آئے تھے کہ آپ کی پوری امت میں ۴-۶ اولیاء اللہ پیدا ہو جائیں؟ نہیں‘ یہ خیال تو آپ ﷺ کے فیض کی بڑی توہین ہوگی‘ آپؐ تو اس دولت کو عمومی طور پر تقسیم کرنے آئے تھے‘ اور یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ شروع کے دور میں عام مسلمانوں کو یہ دولت ملی تھی‘ اور

یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ دنیا کے انسانوں کے دل اس پوری (مسلمان) قوم کی طرف‘ اور اس کے طریقہ زندگی کی طرف‘ اسی طرح بلکہ اس سے زیادہ کھینچنے لگے تھے‘ جتنے آج ان اِکا دُکا اللہ والوں کی طرف کھینچتے ہوئے دکھائی پڑتے ہیں۔

حضرت مفتی محمد تقی عثمانی اپنے والد ماجد حضرت مفتی محمد شفیعؒ سے روایت کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت مفتی صاحب دیوبند سے دہلی گئے۔ وہاں ان کے علم میں یہ بات آئی کہ حضرت مولانا محمد الیاسؒ‘ بانی تبلیغی جماعت بیمار ہیں۔ چنانچہ ان کی عیادت کے لیے وہ تبلیغی مرکز‘ بستی نظام الدین پہنچے۔ وہاں معلوم ہوا کہ زیادہ بیماری اور کمزوری کی وجہ سے معالجین نے ملاقات سے منع کر رکھا ہے۔ چنانچہ حضرت مفتی صاحب نے وہاں موجود لوگوں سے کہہ دیا کہ میں تو عیادت کے لیے حاضر ہوا تھا‘ معالجین نے چونکہ ملنے سے روک رکھا ہے اور حالات بھی معلوم ہو گئے‘ اس لیے ملاقات کا اہتمام کرنے کی ضرورت نہیں۔ بس جب حضرت کی طبیعت بہتر ہو تو ان کو میرے آنے کا بتا دیں اور سلام بھی عرض کر دیں۔ اس کے بعد حضرت مفتی صاحب نے رخصتی چاہی۔ کسی نے اندر جا کر مولانا محمد الیاس کو بتا دیا کہ حضرت مفتی محمد شفیع آئے تھے۔ اس پر حضرت نے فوراً ایک آدمی پیچھے دوڑایا کہ مفتی صاحب کو بلا لائیں۔ چنانچہ آپ واپس آ گئے‘ حضرت مولانا کے پاس بیٹھے اور ان کی مزاج پرسی کی۔ اس دوران مولانا محمد الیاس نے حضرت مفتی صاحب کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور بے ساختہ رو پڑے اور پھر زار و قطار رونا شروع کر دیا۔

حضرت مفتی صاحب کا کہنا تھا کہ میں نے یہ کہا کہ اس وقت تکلیف اور بیماری کا طبیعت پر اثر ہے‘ اس لیے تسلی کے کچھ کلمات کہے۔ اس پر بانی تبلیغی جماعت نے فرمایا کہ میں تکلیف اور بیماری کی وجہ سے نہیں رو رہا‘ بلکہ مجھے اس وقت دو فکریں اور اندیشے لاحق ہیں‘ انہی کی وجہ سے پریشان ہوں اور رونا آ رہا ہے۔ حضرت مفتی صاحب نے پوچھا کہ کون سی دو فکریں لاحق ہیں؟ تو مولانا محمد الیاسؒ نے جواب دیا کہ پہلی بات تو یہ ہے کہ (تبلیغی) جماعت کا کام اب روز بروز پھیل رہا ہے اور الحمدللہ اس کے نتائج اچھے نظر آ رہے ہیں‘ لوگ جوق در جوق جماعت میں وقت لگا رہے ہیں۔ اب مجھے یہ ڈر لگتا ہے کہ جماعت کی یہ کامیابی کہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ’استدراج‘ نہ ہو۔ (استدراج اس کو کہتے ہیں کہ کسی غلط کار آدمی کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ڈھیل دے دی جاتی ہے اور اس کو ظاہری کامیابیاں بھی حاصل ہوتی ہیں‘ لیکن حقیقت میں وہ کام اللہ تعالیٰ کی رضامندی والا نہیں ہوتا۔)

اس پر حضرت مفتی صاحب نے فوراً عرض کیا کہ حضرت! میں آپ کو اطمینان دلا سکتا ہوں

کہ یہ کام استدراج نہیں ہے۔ حضرت مولانا نے فرمایا کہ آپ کے پاس اس کی کیا دلیل ہے؟ حضرت مفتی صاحب نے عرض کیا کہ اس کی دلیل یہ ہے کہ جب کسی کے ساتھ استدراج کا معاملہ ہوتا ہے تو اس شخص کے دل و دماغ پر یہ واہمہ اور شبہ تک بھی نہیں گزرتا کہ یہ استدراج ہے۔ آپ کو چونکہ اس کام پر استدراج کا شبہ ہو رہا ہے‘ تو یہ شبہ خود اس بات کی دلیل ہے کہ یہ استدراج نہیں ہے۔ اگر یہ استدراج ہوتا تو آپ کے دل میں کبھی اس کا خیال بھی پیدا نہ ہوتا۔ اس لیے میں آپ کو اس بات کا یقین دلاتا ہوں کہ یہ استدراج نہیں‘ بلکہ جو کچھ ہو رہا ہے‘ یہ سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے مدد اور نصرت ہے۔ حضرت مفتی صاحب کا کہنا تھا کہ میرا یہ جواب سن کر مولانا محمد الیاسؒ کے چہرے پر بشاشت آ گئی اور فرمایا کہ الحمدللہ! آپ کی اس بات سے مجھے بڑا اطمینان ہوا۔

اس کے بعد مولانا محمد الیاس نے مفتی محمد شفیع سے فرمایا کہ مجھے دوسری فکر یہ لاحق ہے کہ اس جماعت میں عوام کثرت سے وقت لگا رہے ہیں اور اہل علم کی تعداد کم ہے۔ اس لیے میرا دل چاہتا ہے کہ اہل علم کثرت سے اس جماعت میں وقت لگائیں اور وہ اس جماعت کی قیادت سنبھالیں۔ اس پر حضرت مفتی صاحب نے عرض کیا کہ آپ کی یہ فکر بالکل صحیح ہے۔ لیکن آپ نے تو نیک نیتی اور صحیح طریقہ پر کام شروع کیا ہے‘ اب آگے چل کر اس کام (جماعت) کو کوئی خراب کر دے‘ تو ان شاء اللہ آپ پر اس کی کوئی ذمہ داری نہ ہوگی۔ تاہم یہ بات صحیح ہے کہ اہل علم کو چاہیے کہ وہ آگے آئیں اور مجموعی طور پر جماعت کے کام پر نظر رکھیں‘ بلکہ جماعت کی قیادت کریں۔ (اس واقعہ سے اندازہ ہو جانا چاہیے کہ حضرت مولانا محمد الیاسؒ کا خلوص کس درجے کا تھا اور ان کے جذبات کس مقام پر تھے‘ اور تبلیغی جماعت جب بھی اس نقطہ سے ہٹے گی تو اس کا کیا حال ہوگا‘ راقم) ❁❁❁

حاجی عبدالواحد صاحبؒ کے نام مولانا محمد منظور نعمانیؒ کے چند مکاتیب:

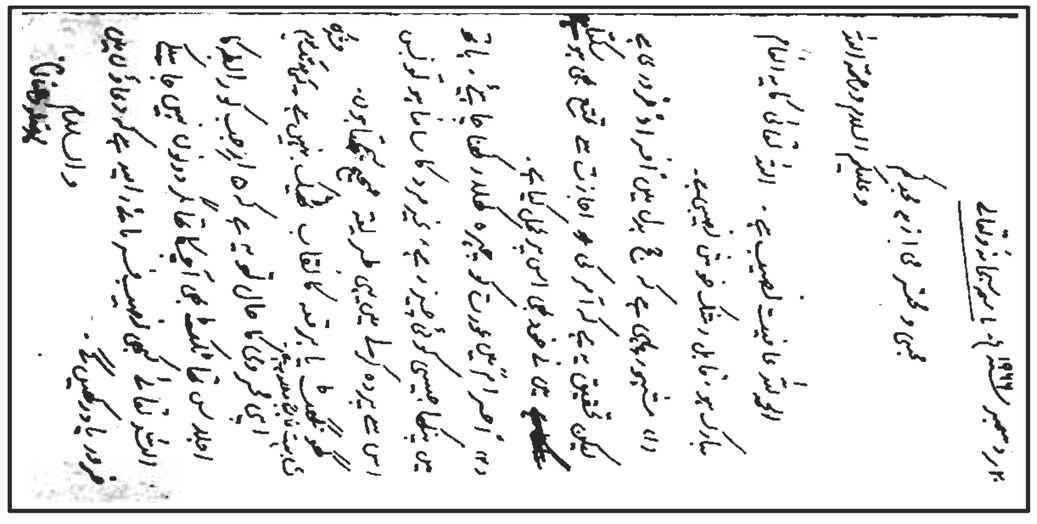

पोस्ट कार्ड
POST CARD
केवल पता
ADDRESS ONLY

INDIA

مکرمی و محترمی جناب حاجی عبدالواحد صاحب ایم اے

۴۹ علامہ اقبال روڈ لاہور

Lahore

(W. Pakistan)

لکھنؤ — باسمہ سبحانہ و تعالیٰ — ۱۳ محرم الحرام [illegible]

مکرمی و محترمی زید مجدکم، السلام مسنون۔

خدا کرے مزاج ہر طرح بعافیت ہو۔ یاد ہوگا
کہ ایک دفعہ میں نے "اسلام کیا ہے" کے انگریزی
ترجمہ کے لیے آپ سے عرض کیا تھا۔ لیکن اس
صحبت میں بات ناتمام سی رہ گئی تھی۔ ابھی کچھ روز
ہوئے لاہور ہی سے [illegible] یوسف سلیم صاحب چشتی نے مجھے لکھا کہ میری
تین کتابوں کا انگریزی ترجمہ کر کے یا کرا کے شائع کرانا چاہتے ہیں۔
میں نے ان کو لکھ دیا کہ ایک کتاب "دین و شریعت" کا ترجمہ ہو گیا ہے اور لیبیا کی
ایک مجلس اسکو شائع کر رہی ہے۔ اور دوسری کتاب "اسلام کیا ہے" کے لیے
میں اپنے دوست حاجی عبدالواحد صاحب سے کہہ چکا ہوں چونکہ وہ اس کام کے بہت زیادہ
اہل ہیں اس لیے میں ان سے اصرار کروں گا اسکے بعد [illegible]
کی مرضی پر چھوڑ دوں گا۔ بہرحال اب مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ "اسلام کیا ہے" کے
انگریزی ایڈیشن کا مختلف جہات سے تقاضا ہے اور مجھے امید ہے کہ [illegible]
[illegible] اسکو [illegible] دینی [illegible] کا وسیلہ بنائے گا۔

بے تکلف بتائیے کہ اگر میں اصرار کروں تو آپ اسکا ترجمہ کی زحمت گوارا
فرما سکیں گے۔ ترجمہ کرنے والے اور بھی مل سکتے ہیں۔ لیکن ارشد صاحب نے اس بارے
میں مجھے آپکا بہت معتقد بنا دیا تھا۔ اس لیے میں چاہتا تھا کہ "اسلام کیا ہے" کا ترجمہ
اگر ہو سکے تو آپ ہی کر دیں۔ بے تکلف جواب عنایت فرمائیے۔

آپکی تینوں کتابیں منشی بشیر احمد صاحب کے پاس بھجوا دی گئی تھیں
انہوں نے حافظ صدیق صاحب کو پہنچا دی ہوں گی اور انہوں نے آپکے پاس [illegible]
میں چاہتا تھا کہ میں خود ہی [illegible] پہنچاؤں لیکن [illegible] سے میرا جانا نہیں [illegible]
[illegible] ناظر ہوگی۔ خدا کرے ہر طرح عافیت ہو۔ مولانا علی میاں [illegible]

[illegible]

Phone—[illegible]

Nida-E-Millat ندائے ملت

BAGH GONGEY NAWAB — باغ گونگے نواب، لکھنؤ

Ref. No.................. Lucknow..........13.X.......1963

محترمی مکرمی زید مجدکم۔ وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ

گرامی نامہ مرقومہ مورخہ ۳ اکتوبر کل ۱۲ اکتوبر کو مجھے ملا۔ اللہ تعالیٰ
جزائے خیر دے آپ نے اتنی تفصیل سے لکھا ہے کہ عرصہ سے خط نہ آنے کی پوری
تلافی ہوگئی۔ جزاکم اللہ تعالیٰ۔
سب سے پہلے تو یہ خوشخبری سنا دوں کہ حضرت قدس سرہٗ کی سوانح کے بالکل
آخری اوراق پریس میں چھپ رہے ہیں۔ مقدمہ مجھے لکھنا تھا وہ میں نے پرسوں ہی
لکھ کر دیا ہے اس میں ہم تینوں کے پچھلے سفر رائے پور کا ذکر بھی آیا ہے۔ امید ہے
کہ پوری کتاب انشاء اللہ دلچسپی سے پڑھی جائے گی اور نافع اور موثر ہوگی۔ اللہ تعالیٰ
قبول فرمائے۔

۲۔ ندائے ملت کے سلسلہ میں آپ کے مشوروں پر انشاء اللہ پوری طرح عمل کی کوشش
کی جائے گی۔ بھائی افضل صاحب اور مفتی زین العابدین صاحب کو بھی آج خطوط لکھ
رہا ہوں۔ اپنے دوستوں میں سے ایک صاحب انشاء اللہ پرسوں یہاں سے دہلی ہوتے
ہوئے لاہور روانہ ہو رہے ہیں۔ ان کا یہ سفر ندائے ملت ہی کا سفر ہوگا ان کے پروگرام
میں لاہور۔ لائل پور خصوصیت سے رہیں گے۔

۳۔ صدیق حسن نمبر کا اعلان ندائے ملت میں پڑھا گیا ہوگا۔ ۱۸ اکتوبر کے شمارہ میں
اس سے متعلق میرا ایک تعارفی اور وضاحتی نوٹ انشاء اللہ آئے گا۔ [illegible]
امید ہے کہ یہ نمبر انشاء اللہ سالنامہ کی بہ نسبت مختصر ہونے کے باوجود مقصد کے
لحاظ سے بہت اہم ہوگا۔

۴۔ آپ نے غضب کیا کہ "شوشتری تعارف" کے بارے میں اب تک مجھے نہیں لکھا اگر

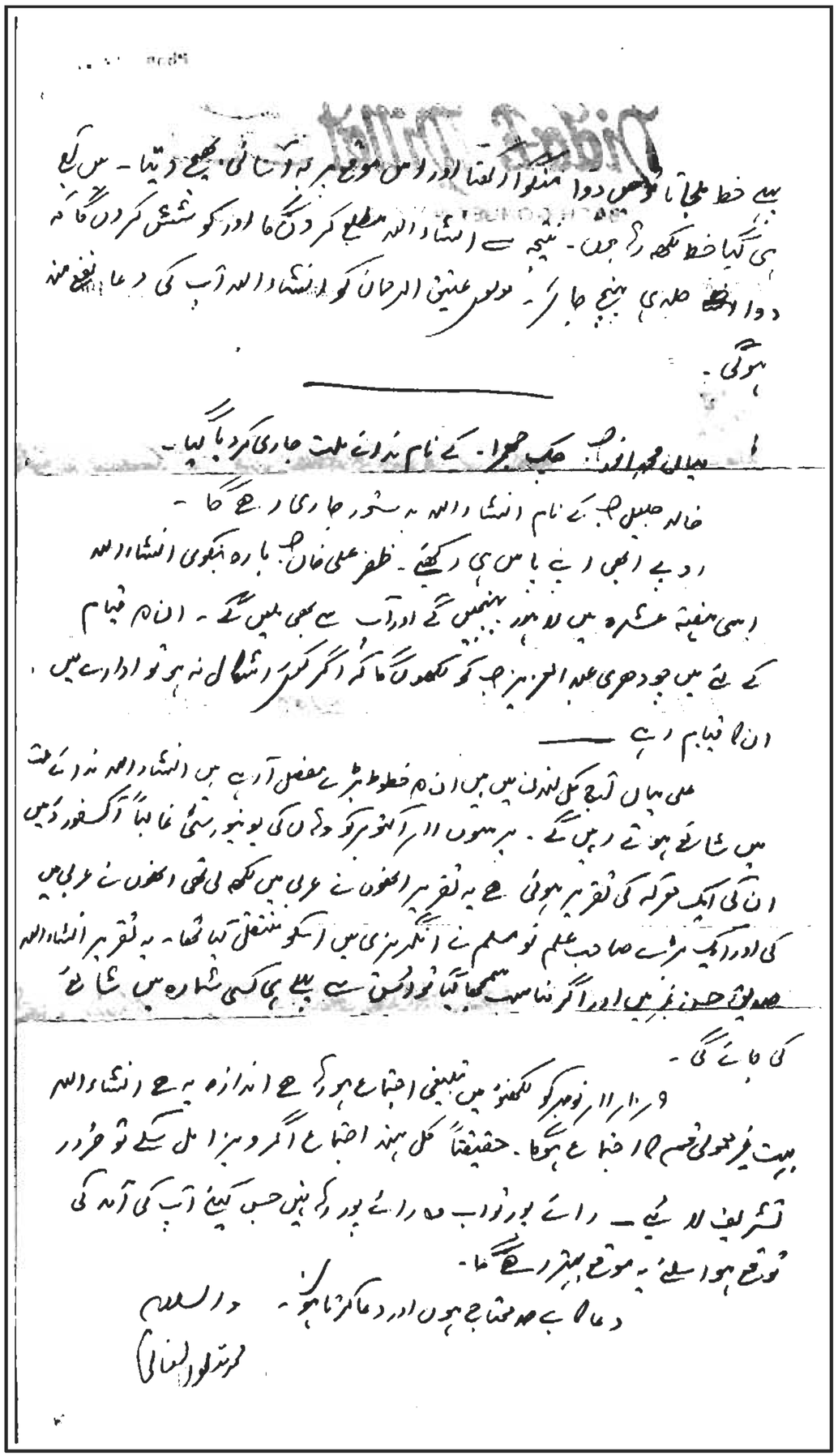

پہلے خط ملتا تو مضمون دوا منگوا لیتا اور اس موضوع پر تو آسانی سے بھیج دیتا۔ میں کل
ہی گیا خط لکھ رہا ہوں۔ نتیجہ سے ان شاء اللہ مطلع کروں گا اور کوشش کروں گا کہ
دوا جلد ہی پہنچ جائے۔ مولوی عتیق الرحمان کو ان شاء اللہ آپ کی دعا پہنچ گئی
ہوگی۔

میاں محمد اسلم صاحب ملک چھجرا کے نام ندائے ملت جاری کردیا گیا۔
خالد حبیب صاحب کے نام ان شاء اللہ بدستور جاری رہے گا۔
روپے ابھی اپنے پاس ہی رکھیے۔ ظفر علی خان صاحب بارہ بنکوی ان شاء اللہ
اسی ہفتہ عشرہ میں لاہور پہنچیں گے اور آپ سے بھی ملیں گے۔ ان کے قیام
کے لئے میں چودھری عبدالعزیز صاحب کو لکھ دوں گا کہ اگر کوئی اشکال نہ ہو تو ادارے میں
ان کا قیام رہے۔

میں یہاں آج کل لندن میں ہیں ان کے خطوط بڑے مفصل آرہے ہیں ان شاء اللہ ندائے ملت
میں شائع ہوتے رہیں گے۔ ہر ہفتوں ۱۱ اکتوبر کو وہاں کی یونیورسٹی غالباً آکسفورڈ میں
ان کی ایک معرکہ کی تقریر ہوئی ہے یہ تقریر انھوں نے عربی میں لکھ لی تھی انھوں نے عربی میں
کی اور ایک بڑے صاحب علم نو مسلم نے انگریزی میں اسکو منتقل کیا تھا۔ یہ تقریر ان شاء اللہ
صدق جدید میں اور اگر مناسب سمجھا گیا تو دوستوں سے پہلے ہی کسی شمارہ میں شائع
کی جائے گی۔

۹، ۱۰، ۱۱ نومبر کو لکھنؤ میں تبلیغی اجتماع ہو رہا ہے اندازہ یہ ہے ان شاء اللہ
بہت غیر معمولی قسم کا اجتماع ہوگا۔ حقیقتاً کل ہند اجتماع اگر ویزا مل سکے تو ضرور
تشریف لائیے۔ رائے یور نورب وہ رائے پور کہیں حسب کیفیت آپ کی آمد کی
توقع ہو اسلئے یہ موقع بہتر رہے گا۔

دعا کا بے حد محتاج ہوں اور دعا کرتا ہوں۔ والسلام

محمد منظور نعمانی

جبکہ روس کے زیر اثر وسط ایشیا کی وہ تمام ریاستیں ہیں جو مستقبل کی سب سے بڑی معدنی دولت کی حامل ہیں۔ دوسری طرف روس چائنا کے معاشی منصوبوں کی پشت پر بھی کھڑا ہے۔ اگر یہ منصوبے کامیاب ہو جاتے ہیں تو روس اور چائنا مستقبل کی سب سے بڑی معاشی طاقتیں بن جائیں گے، جبکہ یورپ اور امریکہ کا اثر ورسوخ نہ صرف دنیا میں محدود ہو جائے گا بلکہ معاشی اور عسکری زوال بھی ان کا مقدر بن جائے گا۔ اس سٹریٹیجیکل پس منظر میں پاکستان کی اہمیت بنیادی اہمیت کی حامل ہے، کیونکہ چائنا اور روس کے یہ معاشی منصوبے پاکستان کے تعاون سے ہی پایۂ تکمیل تک پہنچ سکتے ہیں، جبکہ بھارت امریکی عزائم کو پورا کرنے میں کوشاں ہے۔ وہ ایران کے ساتھ مل کر چاہ بہار کے منصوبے پر بھی کام کر رہا ہے اور وہیں سے کلبھوشن جیسے دہشت گردوں کے ذریعے بلوچستان کے حالات خراب کرنے میں بھی ملوث رہا ہے۔ دوسری طرف براستہ افغانستان بھی پاکستان میں دہشت گردی میں ملوث رہا ہے، لیکن اتنے جتن کرنے کے باوجود بھی وہ اپنے مقاصد میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ ہمارے خیال میں پلوامہ حملے کی آڑ میں وہ دوبارہ پاکستان میں دراندازی کے ذریعے امریکی عزائم کو پورا کرنے کی کوشش بھی کر سکتا ہے۔

ان تمام حالات میں سب سے ضروری امر یہ ہے کہ ہم اپنے ملک پاکستان میں باہمی امن وہم آہنگی کی فضا پیدا کریں۔ اگر اپنا گھر ٹھیک ہوگا تو ہم مل کر دشمن کا مقابلہ کر سکیں گے اور اس کو منہ توڑ جواب دے سکیں گے، لیکن اگر گھر میں ہی اتفاق نہ ہوا تو پھر شاید ہم کسی بھی سازش کا مقابلہ نہ کر سکیں۔ آج ہمارے ملک میں علاقائی، نسلی اور لسانی تفریق، تعصبات اور منافرتیں اسی لیے پھیل رہی ہیں کہ ہم سب نے مل کر یہ ملک جس نظریہ کی بنیاد پر حاصل کیا تھا، اس نظریے کو ہم نے بھلا دیا ہے۔ وہ نظریہ یہ تھا کہ ہم پاکستان کو ایک اسلامی فلاحی ریاست بنائیں گے، لیکن ۷۱ سال میں اس طرف بڑھنے کی بجائے ہم پسپائی ہی اختیار کرتے چلے گئے۔ لہٰذا علاقائی، لسانی اور مذہبی اختلافات نے بدترین انتشار کی شکل اختیار کر لی۔ اسی انتشار کی وجہ سے ۱۹۷۱ء میں قدرت نے ہماری پیٹھ پر کوڑا برسایا تھا۔ ہمیں دشمن کو دندان شکن جواب دینے کے لیے ایک متحد قوم بننا ہوگا۔ البتہ یہ فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ ہمارے پاس اتحاد کے لیے دین اسلام کے علاوہ کوئی بنیاد موجود نہیں ہے۔

Mar 2019
Vol.68

Regd. CPL No.115
No.3

Monthly **Meesaq** Lahore

بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمدؒ

کی (۲) کتب

قلبِ قرآن
سورۂ یٰسٓ
کی مختصر تشریح

صفحات: 152، قیمت: 130 روپے

خطباتِ سیرت علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام

صفحات: 196، قیمت: 160 روپے

خود پڑھیے   دوسروں کو تحفہ دیجیے!

مکتبہ خُدّام القرآن لاہور
36۔ کے ماڈل ٹاؤن لاہور   فون: 35869501-03
maktaba@tanzeem.org